کہانی مجھے ملی
(دس کہانیاں)
اصغر ندیم سی
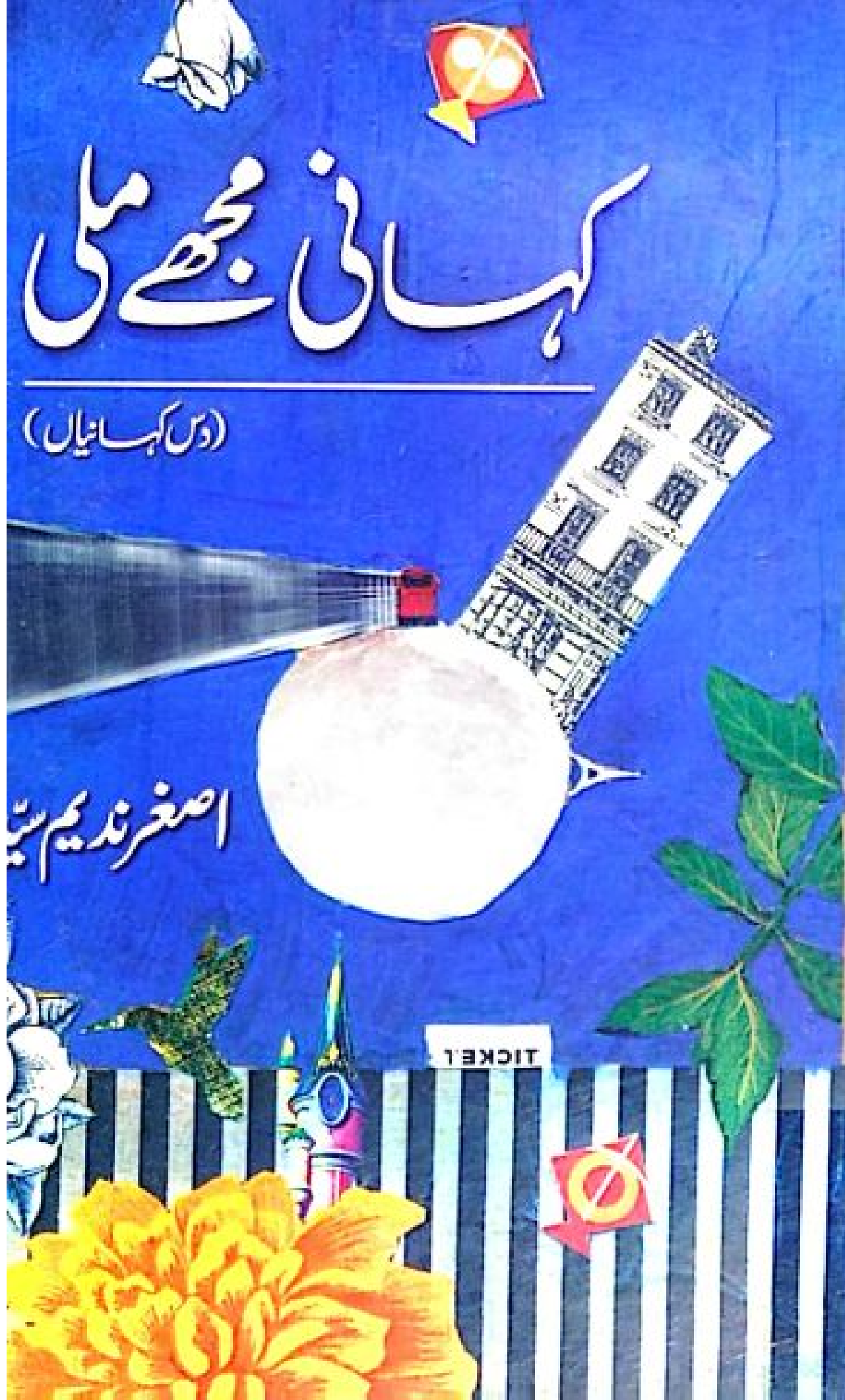
پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
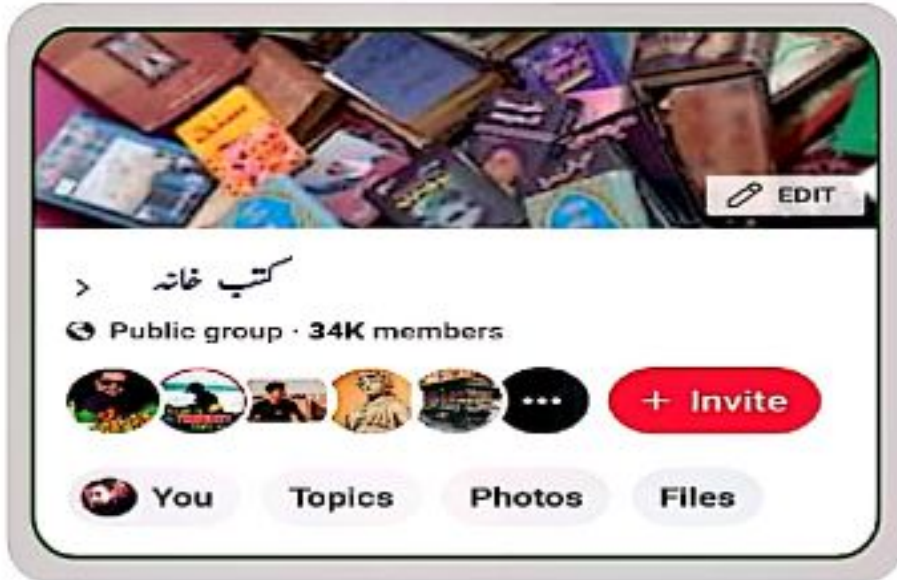
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

(دس کہانیاں)

اصغر ندیم سیّد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

ترتیب

1- کہانی کی تلاش 7

2- بٹوارہ 16

3- المعروف گھسیلے شاہ 28

4- ایک اور ٹوبہ ٹیک سنگھ 45

5- سجنا کی کہانی 63

6- ایک اور شہر افسوس 85

7- شانتی.....شانتی سے ہے 103

8- لندن2050ء 118

9- ہمارے ہیرو واپس کرو 145

10- سمندر پر کیا گزری 158

یہ کہانیاں اور اس کے کردار کہیں پر بھی ہو سکتے ہیں۔
کہانی مسلسل حرکت میں رہتی ہے۔ جیسے ہم اور آپ۔ مجھے
یہ کردار کہیں نہ کہیں ملے ضرور ہوں گے جو میرے تخیل سے
میرے ہو گئے۔ ان کا حقیقی اور خیالی ملاپ میرے ذریعے
ہوا ہے۔ آپ انہیں فرضی کردار بھی کہہ سکتے ہیں جن کا کسی
سے مماثل ہونا محض اتفاق ہوگا۔ یہ اتفاق ہی کہانی کو زندگی
آمیز بنا دیتا ہے۔

اصغر ندیم سید

کہانی کی تلاش میں

کہانی کو میں نے کئی دفعہ منٹو صاحب کے گھر کے باہر چبوترے پر اداس بیٹھے دیکھا۔ پہلے سوچا اسے گود لے لوں۔ پھر ڈر گیا کہ اسے پالنا پوسنا پڑے گا۔ میں کہانی کی ذمہ داری سے ڈرتا تھا۔ ویسے بھی سنا تھا کہانی کے رہنے کے لیے مصلحت، منافقت اور تعصب سے پاک ماحول ضروری ہوتا ہے اور میں ان تینوں سے آلودہ ماحول میں رہتا ہوں۔ کئی بار سوچا کہانی رہنے کے لیے گود تلاش کر رہی ہے۔ مجھے اسے گود لے لینا چاہیے۔ میری طرح یہ بھی آہستہ آہستہ مصلحت، منافقت اور تعصب کی عادی ہو جائے گی۔ لیکن دل نہیں مانا۔ پھر کئی موقعوں پر کہانی کو میں نے مختلف علاقوں اور جگہوں پر دیکھا۔ کبھی مجھے کہانی نبی گلی کے ایک کوٹھے کی سیڑھیوں پر بیٹھی ملی۔ میں ڈر گیا۔ اس لیے کہ چند لمحوں بعد اس کوٹھے سے موہنی عرف نازلی کا جنازہ اترنے والا تھا۔ بہت سی سیاہ لباس میں ملبوس طوائفیں ماتم کرتے ہوئے اس جنازے کو رخصت کر رہی تھیں۔ میں پہلی بار کہانی کے پاس گیا۔ وہ ڈر گئی کیوں کہ میں اس کے لیے اجنبی تھا۔ میں نے اُس سے کہا میں اتنا بُرا آدمی نہیں ہوں۔ بتاؤ یہ جنازہ کس کا ہے اور یہاں کیا ہوا ہے۔ کہانی کو مجھ پر شک گزرا کہیں میں کسی ایجنسی یا خفیہ پولیس کا آدمی تو

نہیں ہوں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ میں صرف بچوں کو پڑھاتا ہوں اور کبھی کبھی شاعری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کہانی کے دل میں بھادوں کے بادل کے پیچھے سورج کی کرن لہرائی۔ اور وہ کچھ مائل ہوگئی کہ مجھے بتائے یہاں کیا ہوا ہے؟ اس نے بتایا کہ موہنی عرف نازلی بہت خوبصورت تھی اور اس کو مجرے پر جیبوں میں کھنکھناتے سکے لے کر تاجر، بیوپاری، لکھ پتی، ڈاکو، چور، سیاست دان اور دیر تک شراب پینے والے جرنیل اور سرکاری افسر آتے تھے۔ کبھی کبھی جج، جواری اور مذہبی معززین بھی آتے تھے۔ موہنی عرف نازلی کبھی کبھی شاعری بھی پڑھتی تھی۔ اندر سے خیالوں میں رہنے والی لڑکی تھی۔ جب کبھی فیض صاحب اور صوفی تبسم آتے تھے تو وہ سارے گاہکوں کو جانے کے لیے کہہ دیتی۔ اچھے لوگ ہوتے تھے۔ موہنی عرف نازلی کی بات سن کر چلے جاتے تھے۔ لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ فیض صاحب پطرس بخاری اور عابد علی عابد اچانک حمید اختر کے ساتھ آ گئے۔ دراصل موہنی عرف نازلی حمید اختر کے ساتھ کچھ فلم میں آنے کے لیے بات چیت کر رہی تھی۔ اس وجہ سے موہنی عرف نازلی نے وہاں بیٹھے ہوئے فیصل آبادی تاجروں کے لیے ناچنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ وہ وقت تھا جب لائل پور کو نیا نیا فیصل آباد میں تبدیل کرنے کا جرنیلی فیصلہ ہوا تھا۔ ایک فیصل آبادی تاجر رانا عبدالشکور عرف حاجی لوہاں والا بہت سی کھڈیوں، رائس ملز اور سوتر منڈی میں آڑھت کا مالک تھا۔ موہنی عرف نازلی کے انکار پر اپنی توہین برداشت نہ کر سکا اور دو گولیاں جرمن ساخت کے پستول سے اس کے سینے میں اتار دیں اور سیڑھیاں اتر گیا۔

کہانی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر کہانی وہاں سے جانے لگی تو میں نے پوچھا تم کہاں رہتی ہو۔ اس نے بتایا کہ وہ بے گھر پھرتی ہے۔ ابھی عارضی طور پر ایک

ایسے مصور کے پاس رہتی ہے جو فخر سے کہتا ہے کہ اس کی ماں یہاں طوائف تھی اور اسے اپنے باپ کا پتہ نہیں ہے۔ میں نے پوچھا اسی مصور نے تمھیں گود لیا ہے۔ اس نے بتایا نہیں۔ پالتو بلی کے ساتھ میں بھی وہاں رہتی ہوں کیوں کہ اُس میں منافقت اور جھوٹ کے ساتھ ملمع کاری نہیں ہے۔ اس کے بعد کافی دنوں تک کہانی مجھے دکھائی نہیں دی۔ ایک دن پاک ٹی ہاؤس کے باہر مل گئی۔ جہاں اب ٹائروں کی دکان فٹ پاتھ پر کھل چکی تھی۔ میں نے پوچھا یہاں تو اب کوئی نہیں آتا۔ کہنے لگی رات کے پچھلے پہر جب پچھم کی ہوا چلتی ہے تو یہاں سے ناصر کاظمی گزرتا ہے اور ایک نگاہ ادھر بھی ڈالتا ہے۔ ادھر میں جی پی او کی دیوار کے ساتھ راجندر سنگھ بیدی کو رکے ہوئے کلاک کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوا دیکھتا ہوں۔ اب کہانی کچھ کچھ مجھ سے مانوس ہونے لگی تھی۔ پھر بھی میں نے اسے گود لینے کی کوئی بات نہیں کی۔ ایک دن کہانی اشفاق احمد کے داستان سرائے کے باہر مجھے مل گئی۔ میں مسکرایا اور اس سے کہا آخر تمھیں ٹھکانہ مل ہی گیا۔ اس سرائے میں تم ہمیشہ کے لیے قیام کر سکتی ہو۔ کہنے لگی جس کا نام ہی سرائے ہو۔ اس میں مستقل قیام کیسے کوئی کر سکتا ہے۔ میں نے کہا پھر تم یہاں کیوں کھڑی ہو اشفاق احمد تو اس سرائے کا مسافر تھا۔ وہ تو چلا گیا ہے۔ کہانی مسکرائی اور کہنے لگی جو بڑھیا چاند میں رہتی ہے دراصل وہ چاند میں قید نہیں ہے۔ اس نے چاند کو قید کر رکھا ہے۔ اسی طرح چاند میں رہنے والی اس بڑھیا کی ایک بہن داستان سرائے میں رہتی ہے۔ ایک بار داستان سرائے میں کہانی چند دن ٹھہرنے کے لیے رکی تھی۔ اس بڑھیا نے اسے ہمیشہ کے لیے قید کر دیا ہے۔ میں روز یہاں آتی ہوں کہ اسے رہائی دلاؤں۔ اپنے ساتھ لے جاؤں لیکن..... ''تمھیں اُس کا ساتھ چاہیے؟ میں نے اسے ٹوکا۔'' ہاں میں اکیلی پڑ گئی ہوں۔ مجھے اس کا ساتھ چاہیے۔ میں نے کہانی کو گود لینے کا

ارادہ ظاہر کیا۔ کچھ دیر تو وہ مجھ پر اعتماد کرنے کو تیار نہ ہوئی۔ پھر اس نے خود کو میرے حوالے کر دیا۔ میں نے کہانی کو گود لے لیا۔ اسے اپنے گھر لے آیا۔ وہ میری study دیکھ کر خوش ہوئی کہ وہ یہاں رہے گی۔

جیسے میں چاہتا تھا کہانی خود کو لکھتی تھی۔ کبھی جاگیرداروں کی غلام گردشوں میں پیدا ہونے والے بچوں کی باتیں۔ کبھی کسی مولانا کے حصے میں آنے والی حلالہ کی خواہش مند عورتیں، کبھی کسی شاعر کی مسحور کن شخصیت اور شاعری کے فریب میں آنے والی متوسط گھرانوں کی لڑکیاں جو کالجوں میں خوابوں کی کشیدہ کاری کرتی ہوئی اس کی گود میں گر جاتی ہیں۔ کہانی خود کو لکھتی رہی۔ جیسے میں اسے کہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ناراض ہو جاتی تھی کہ تم مجھے دہرا رہے ہو۔ تمہارے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا۔ میں اسے سمجھاتا کہ ہر کہانی گود لینے والا خود کو دہراتا ہے۔ تم مجھے کوئی نام بتاؤ جس نے خود کو نہ دہرایا ہو۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، اے حمید، بیدی، کرشن، پریم چند۔ بولو۔ کیا سب نے خود کو نہیں دہرایا۔ کہانی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ جسے تم دہرانا کہہ رہی ہو۔ وہ دراصل ایک ہی بات کا کوئی اور Shade ہوتا ہے۔ کئی Shade اور کئی Inter pretation ہوتی ہیں۔ جیسے ہیملٹ کی تین Inter pretation پر تین فلمیں بن چکی ہیں۔ وہاں تو کہانی نے خود کو نہیں دہرایا۔ ایسے ہی "امراؤ جان ادا" پر تین فلمیں اور سیریل بنیں۔ وہاں تو کہانی نے خود کو نہیں دہرایا۔ کہانی ہنسی اور ہنستی گئی۔ کہنے لگی۔ تم چالاک، مکار اور اچھے سیلز مین ہو۔ میں نے کہا ہر کہانی لکھنے والے کو چالاک، مکار اور اچھا سیلز مین ہونا چاہیے۔ کیا وہ سب بڑے کہانی کار ایسے نہیں تھے۔ یا ایسے نہیں ہیں۔ چارلس ڈکنز سے لے کر ہمینگوے اور ہرمن ہیس سے مارکیز تک۔ اور چھوڑو شیکسپیئر پر تو اب ایک کتاب آ گئی ہے "Shakespears was Fraud?"

کہانی کہنے لگی مگر وہ اعلیٰ درجے کے چالاک، مکار اور اچھے سیلز مین تھے۔ تم نچلے درجے کی Specie ہو۔ میں نے کہانی سے اتفاق کیا اس طرح ہمارا رشتہ ٹوٹنے سے بچ گیا۔ اور اس دوران کہانی سمجھوتہ کرتی گئی۔ میں نے دیکھا وہ کافی دانش اور حلیم طبیعت کے ساتھ وچھے مزاج کی راضی برضا قسم کی مخلوق بن گئی تھی۔ جیسے بوڑھی بلی تھیجے پر سارا دن دم ہلاتی لیٹی رہتی ہے۔ کئی دفعہ میں نے تشویش سے دیکھا کہ اس طرح تو کہانی اپنے اندر خاموش ہو جائے گی۔ لیکن ایک دن کیا ہوا؟

میں نے کہانی سے کہا جیسے میں کہتا ہوں لکھو۔ اس نے بغاوت کر دی کہ نہیں میں اب تمہاری غلام نہیں رہوں گی۔ جیسا چاہوں گی خود لکھوں گی۔ اصل میں یہ معاملہ بگڑا اس وقت جب میں نے اس سے کہا کہ تم ایسے غریب سندھی کی کہانی لکھو جس نے پارلیمینٹ ہاؤس کے سامنے خود کو آگ لگا کر خودکشی کر لی۔ اور اس کی خودکشی غربت کے خلاف احتجاج تھی۔ اس کی خودکشی کے دوسرے دن اس کے ہاں تیسرے بچے کی پیدائش ہوئی۔ وہ حکومتی جماعت کا ووٹر تھا۔ اس کے گھر میں فاقہ کشی کی نوبت آ چکی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

کہانی نے میرا سارا تعلق ایک طرف کر کے۔ بغاوت کا علم بلند کر دیا اور کہا کہ یہ خودکشی نہیں تھی قتل تھا۔ اس لیے میں خود کو اپنی مرضی سے لکھوں گی۔ میں نے سمجھایا کہ پورا میڈیا گواہ ہے اس نے تیل چھڑک کر خود کو آگ لگائی۔ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔ اس نے کہا پاکستانی میڈیا پر اعتبار کرنے والے پہ میں کیسے اعتبار کروں۔ کہانی لکھنے لگی کہ اس آدمی نے خودکشی نہیں کی تھی۔ اس کا قتل ہوا تھا۔ میں نے کہا مگر اس کی لاش تو پارلیمینٹ کے سامنے سے برآمد ہوئی تھی۔ اس کا قتل کس نے کیا اور کہاں کیا۔ کہانی نے بتایا کہ اس کا قتل سندھ کے اسی گاؤں میں ہوا تھا۔ وہ پارلیمینٹ ہاؤس میں

اس قتل کی ایف آئی آر درج کرانے آیا تھا۔ میں نے دلیل دی کہ سنو اگر وہ قتل ہوا ہے تو اسے اتنی دور ایف آئی آر درج کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ کراچی قریب تھا۔ وہ کراچی کے کسی تھانے میں درج کرا سکتا تھا۔ اپنے قریبی گوٹھ کے تھانے میں۔

یہ ایسا قتل ہے جس کی ایف آئی آر صرف پارلیمینٹ کے سامنے درج ہو سکتی تھی۔ کہانی نے استدلال دیا اور پھر کہا یہ خودکشی ہوتی تو وہ اپنے گھر میں بھی زہر کھا کے مر سکتا تھا۔ وہ گھر سے باہر کسی درخت سے لٹک کر خودکشی کر سکتا تھا۔ دریا میں ڈوب کر یا ریل گاڑی کی پٹری پر سر رکھ کر.....اسے پارلیمینٹ ہاؤس پہنچنے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنے لمبے سفر میں خودکشی کا ارادہ تبدیل بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ قتل ہے جو گزشتہ چینسٹھ سال سے ہو رہا تھا۔ مکمل اس دن ہوا ہے۔ کہانی خود بیان کر رہی تھی اور میں سن رہا تھا۔ اب وہ مکمل طور پر آزاد ہو چکی تھی۔ پھر بھی میں نے اسے رام کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس نے قتل کی ایف آئی آر ہی درج کرانی تھی تو ایسا دن کیوں چنا جب نہ وزیر اعظم وہاں تھے نہ صدر وہاں موجود تھے۔ دونوں بیرون ملک دوروں پر تھے۔ کہانی نے سوچ کر کہا۔ اس نے یہ دن اس لیے نہیں چنا تھا کہ وہاں صدر اور وزیر اعظم موجود نہیں ہوگا۔ اس نے یہ دن اس لیے چنا تھا کہ ایک اور قتل ہونا تھا۔ اور یہ قتل بھی چینسٹھ سال سے ہو رہا تھا۔ قتل کا اعلان اسی دن ہوا؟

کہانی کی بغاوت سے میں پریشان نہیں تھا۔ کہانی کے اس روپ کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ کہ کہانی مجھ سے بھی زیادہ جانتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک کہانی سے زیادہ ایک تفتیش کار کے طور پر ثابت کرنے لگی تھی۔ میں نے کہانی سے کہا چینسٹھ سال سے جتنے قتل ہوئے ہیں کیا تمہیں ان کا پتہ ہے؟ کہانی کہنے لگی میرے پاس ہر قتل کا ریکارڈ ہے۔ میں عینی گواہ ہوں ہر قتل کی۔ میں نے کہا اچھا یہ بتاؤ اور کس قتل کی تم گواہ

ہو۔ اس نے بتایا کہ ذوالفقار علی بھٹو قتل ہوئے تھے۔ میں نے کہا یہ تم نے کون سی نئی بات کی ہے سب قانون داں متفق ہیں کہ بھٹو صاحب کا قتل ہوا تھا۔ یہ کون سی گواہی ہے؟ اپنی Credibility کے لیے کوئی Highprofile قتل بتاؤ۔ کہانی نے بتایا۔ تو پھر سنو۔ قائداعظم محمد علی جناح کا قتل ہوا تھا؟ میں نے کہانی سے عرض کی کہ قائداعظم کے سارے مورخ جو ہندوستان سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ تو متفق ہیں کہ قائداعظم کی طبعی موت تھی۔ کہانی بولی بس یہی میرا تمہارا فرق ہے۔ قائداعظم کے مورخ دراصل قائداعظم کے مورخ نہیں ہیں۔ اپنی گھٹیا خواہشوں کے مورخ ہیں یا ان طاقتوں کے مورخ ہیں جو قائداعظم کے قتل کے ذمہ دار تھے۔ میں فوراً ردعمل میں آیا کہ یہ تو تم پاکستان کی تاریخ کو جھٹلا رہی ہو؟ قائداعظم طبعی موت فوت ہوئے تھے۔ کہانی بولی یہ سب ان قاتلوں کی تاریخ ہے۔ تم قاتلوں کے ساتھی ہو۔ قائداعظم قتل ہوئے تھے۔ میں تو بھونچکا رہ گیا۔ اب میں نے کہانی سے پوچھا تمہیں کیا معلوم ہے۔ اتنا تو بتا دو۔ کہانی نے کہا یہ بتاؤ تم نے زیارت کا سفر کیا ہے۔ میں نے کہا ہاں میں دو تین دفعہ خود زیارت گیا ہوں۔ جہاں قائداعظم کی Residensy ہے اور جہاں دنیا کے سب سے قدیم Juniper کے درخت ہیں۔ جواب ختم ہو رہے ہیں۔ کہانی اور بھی اسمارٹ ہوگئی کہنے لگی۔ ٹھیک ہے۔ صرف اتنا بتاؤ کہ اگر قائداعظم کے ڈاکٹر الٰہی بخش کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا مگر ڈاکٹر الٰہی بخش تو ان کے خاندانی ڈاکٹر تھے۔ کہانی نے کہا ضروری تو نہیں خاندانی ڈاکٹر زیادہ سمجھدار ہو۔ یا زیادہ لائق ہو لیکن تم صرف ایک کہانی ہو۔ یہ تمہارا کام نہیں ہے کہ ــــ میں نے ٹوکا ــــ کہانی ہی تو رازداں ہے ہر اس حقیقت کی جو ظاہر بھی ہے اور چھپی ہوئی بھی۔ صرف کہانی سارے بھید جانتی ہے۔ کہانی یہ نہیں سمجھ سکتی کہ قائداعظم کو زیارت میں کیوں لے جایا گیا۔

کہانی نے سوال کیا۔ اس لیے کہ وہ ان کی Residensy تھی۔ میں نے دلیل دینے کی کوشش کی۔ Residensy آرام کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ چھٹیوں میں Relax کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ جان لیوا بیماری کی آخری اسٹیج میں رہنے کے لیے نہیں ہوتی۔

تو پھر یہ ایک قتل کیسے ثابت ہوا۔ میں نے اصرار کیا۔ جو کچھ کراچی میں ہو رہا تھا، جو کچھ مسلم لیگ کے جاگیردار اور اسٹیبلشمنٹ کے طبقے محلاتی سازشوں میں پاکستان کی بنیاد میں اپنے مفادات کے بیج بونے میں مصروف تھے۔ وہ تمہیں دکھائی نہیں دے گا۔ خیر اس کو چھوڑو۔ میں صرف اس سندھی کا واقعہ لکھ رہی ہوں جسے قتل کیا گیا۔ وہ بہت عرصہ پہلے قتل ہو چکا تھا۔ اس نے ایف آئی آر درج کرانے کے لیے اس دن کا انتخاب کیا جب اس جیسا ایک اور قتل رجسٹر ہوا۔ وہ کس کا قتل تھا۔ میں نے کہانی سے پوچھا۔ وہ ایک صابر شاکر عورت کا قتل تھا جس کا نام بیگم نصرت بھٹو تھا۔ یہ قتل اسی دن مکمل ہوا جس دن سندھی ہاری کا قتل مکمل ہوا۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے۔ مگر بیگم نصرت بھٹو کا قتل ایک دن کیسے ہوا۔ وہ تو ایک عرصے سے علیل تھیں اور جب سے ان کے دوسرے بیٹے میر مرتضیٰ بھٹو کو قتل کیا گیا اس دن سے وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی تھیں۔ کسی کو پہچانتی بھی نہیں تھیں۔ یادداشت کھو چکی تھیں اور دبئی کے ایک ہسپتال میں Veg بن چکی تھیں میں نے کہانی کی معلومات درست کرتے ہوئے کہا۔ کہانی خود کو جس طرح لکھے جا رہی تھی وہ کچھ یوں تھا کہ بیگم نصرت بھٹو کو قسطوں میں قتل کیا گیا۔ وہ ٹکڑوں میں زندہ رہی۔ جو صحافی یہ کہتے ہیں کہ ان کی موت قذافی اسٹیڈیم میں پولیس کی لاٹھی سر میں لگنے کے بعد سے ہونا شروع ہوئی تھی۔ وہ سب کے سب ایک سطحی قسم کے لالچی، لفافے باز اور سیاسی پارٹیوں کے پجاری اور مذہب کے نام پر مبنی جماعتوں کے جوڑی دار، کم ظرف، تنگ نظر مفاد

پرست ہیں۔ کبھی ان کو شادی بیاہ یا سیاسی ڈنر کے وقت پلیٹوں کو اور پیٹوں کو بھرتے دیکھو۔ ان کے کپڑے کبھی کھانا کھانے میں مصروف ہوتے ہیں۔ میں نے کہانی سے کہا یہ الگ موضوع ہے تم بیگم نصرت بھٹو کا قتل ثابت کرو۔ کہانی نے بس اتنا کہا کہ اگر تم اب بھی اسے قتل نہیں مانو گے تو پھر میرے پاس تمہیں چھوڑنے کا اس سے اچھا جواز نہیں ملے گا۔ اور پھر کہانی غائب ہوگئی میں اس کے پیچھے بھاگا۔ لیکن کہانی مجھے نظر نہیں آئی۔ میں کہانی کی کھوج میں ہوں کہ اگر اسے تلاش کرلوں تو اس سے معافی مانگوں کہ میں ایک مصلحت پسند، منافقت پسند آدمی تھا۔ تم نے مجھے چھوڑ کے اچھا کیا۔ مگر میری معافی قبول کرلو۔ اب میں بدل چکا ہوں۔ کہانی نے مجھے تبدیل کردیا ہے۔ لیکن اب وہ مجھے نہیں ملے گی۔ ہر بدلنے والے کا یہی اصول ہوتا ہے کہ وہ جب کسی کو تبدیل کرلیتا ہے تو پھر وہ کسی اور کو تبدیل کرنے کے لیے کہیں اور چلا جاتا ہے۔

☆☆☆

بٹوارہ

چنڈی گڑھ کے بلاک نمبر 32 میں ایک سادہ سی کوٹھی میں سردار سرجیت سنگھ برنالہ، اپنی بیوی امرت کور اور بیٹی ریتو کور کے ساتھ رہتا ہے۔ کوٹھی سے ظاہر ہوتا ہے کہ گھر والوں کو فن باغبانی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کوٹھی کی ظاہری شکل سے لگتا ہے کہ اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کوٹھی سردار سرجیت سنگھ برنالہ کے باپو سردار ہرمیت سنگھ برنالہ نے اس مکان کو بیچ کے بنائی تھی جو اُسے بٹالہ میں الاٹ ہوا تھا۔ جب وہ 1947ء میں پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا تھا اور جب اُس نے یہ کوٹھی بنائی تھی تب اُس کی پتنی سروپ کور زندہ تھی۔ اُس کا بیٹا سردار سرجیت سنگھ برنالہ پنجاب کی سروس میں انجینئر کے عہدے پر نیا نیا فائز ہوا تھا۔ اسی کوٹھی میں اُس کی شادی امرت کور سے ہوئی۔ کچھ عرصہ تو اس نئی نئی کوٹھی میں گزارنے کا موقع ملا، یہ اُس وقت کی بات ہے جب چنڈی گڑھ نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ اکا دُکا کوٹھیاں دور دور سے دکھائی دیتی تھیں۔ سردار ہرمیت سنگھ برنالہ اس کوٹھی میں آ کر بے حد بے چین رہنے لگا تھا۔ وہ شروع سے بے چین تھا یا چنڈی گڑھ آ کر بے چین رہنے لگا، اس حوالے سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ جب بٹالہ میں الاٹ شدہ گھر میں قیام تھا تو ان دنوں کی یادیں

سرجیت سنگھ برنالہ نے محفوظ رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ کچھ تو وہ پڑھائی کے لیے بٹالہ سے باہر رہتا تھا اور کچھ وہ اپنے باپو سے جذباتی طور پر زیادہ قریب نہ ہو سکا۔ اُسے بس اتنا یاد ہے کہ جب اُس نے ہوش سنبھالا تو باپو کو ہر وقت آہیں بھرتے دیکھا۔ لاہور کی طرف منہ کر کے آہیں بھرتے تھے اور اپنی پتنی سروپ کور سے پنجاب کی تقسیم پر محمد علی جناح اور ماسٹر تارا سنگھ کو ٹھیٹھ پنجابی میں بے بھاؤ کی سناتے تھے۔ بٹالہ کے گھر کے ساتھ سرکار نے کچھ زمین بھی الاٹ کی تھی جو ہرمیت سنگھ نے ٹھیکے پہ چڑھا دی تھی۔ اُس سے گزارا چل جاتا تھا۔ سردار ہرمیت سنگھ برنالہ کی آہیں بھرنے کی وجہ یہ تھی کہ 1947ء سے پہلے ان کا خاندان لاہور میں آباد تھا۔ باپو کی اکبری منڈی میں میوے کی دکان تھی۔ کشمیر سے لے کر کابل تک سے میوے آتے تھے۔ پورے پنجاب بلکہ سندھ تک کو یہاں سے میوہ سپلائی ہونے لگا۔ کاروبار ایسا پھیلا کہ سردار ہرمیت سنگھ نے باپو کے مرنے کے فوراً بعد ہی لاہور کے شیرانوالہ گیٹ میں ایک شاندار حویلی کھڑی کر دی۔ سنگ مرمر کے فرش تو تھے ہی، لکڑی کا کام چنیوٹی، کشمیری اور لکھنؤ کے کاریگروں سے کرایا گیا۔ اپنے زمانے کے مشہور ہندو آرکیٹیکٹ مہتہ صاحب سے یہ حویلی ڈیزائن کرائی۔ تیار ہونے سے پہلے ہی دور دراز سے لوگ دیکھنے آنے لگے۔ ہرمیت کو جوانی ہی میں ایسی حویلی نصیب ہوگئی کہ اُس کا دماغ زمین پہ نہیں آتا تھا۔ ابھی کچھ ماہ ہی رہنا نصیب ہوا کہ مسلم لیگ کے جلسوں نے اس کی نیندیں حرام کر دیں۔ دیکھتے دیکھتے لاہور کا رنگ ہی بدل گیا۔ دن رات جلسے جلوس، لاؤڈ سپیکر دھاڑنے لگے۔ لے کے رہیں گے پاکستان، بن کے رہے گا پاکستان اور معلوم نہیں کیا کیا نعرے سردار ہرمیت سنگھ برنالہ کا پیچھا کرنے لگے۔ دن تو دن اب تو راتوں کو جلوس نکلنے لگے۔ ٹولیاں گاہے بگاہے نعرے لگاتے گزرنے لگیں۔ شہر لاہور کے بازار اکثر

بندر بنے لگے اور پھر وہ دن آ گیا جب وہ اور اس کی پتنی سروپ کور اپنے پانچ سالہ بیٹے
سرجیت سنگھ برنالہ کو لے کر لاہور سے بٹالہ میں منتقل ہو گئے۔ اس حویلی کی کچھ یادیں
اور ایک تصویر سینے سے لگائے کچھ دن گم سم رہے۔ پھر زندگی نے اپنے موسموں کے
ساتھ بدلنا شروع کر دیا۔ سرجیت اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی اور پھر
ملازمت میں پہنچ گئے۔ بٹالے سے چنڈی گڑھ تک کا سفر اُسے تو اتنا محسوس نہ ہوا کیوں
کہ وہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں ملازمت کے سلسلے میں خانہ بدوش رہے۔ البتہ
اس کے باپو کا دل پھر زندگی میں نہ لگ سکا۔ شاید لاہور کی حویلی کا صدمہ اتنی جڑیں پکڑ
چکا تھا کہ ہرمیت سنگھ کا دل بٹالے کے اس گھر میں نہ لگا جو کسی مسلمان تاجر کا بنایا ہوا
تھا۔ وہ بٹالہ کے گھر میں ایسے تھا جیسے اس کی روح کسی پنجرے میں قید ہو۔ یہی وجہ ہے
کہ جونہی اُسے موقع ملا اُس نے چنڈی گڑھ میں کوٹھی ڈال لی۔ کوٹھی تو بن گئی مگر کوٹھی کو
ڈھنگ کے مکین نہ مل سکے۔ جب کوٹھی بنانے والے کی روح اداس ہو تو کوٹھی کے در و
دیوار سے خوشی کیسے ٹپک سکتی ہے۔ سرجیت سنگھ تو کوٹھی میں مہمان بن کے آتا تھا۔ کوٹھی
میں ہرمیت سنگھ اور اُس کی پتنی سروپ کور اکیلے بس ایک دوسرے کی لاٹھی بنے پڑے
رہتے تھے۔ سرجیت سنگھ اپنی بیوی اور بچّی کے ساتھ کبھی چھٹی پہ آیا کبھی نہ آیا۔ اسی
دوران ہرمیت سنگھ کی پتنی سروپ کور اُسے چھوڑ کر چلی گئی۔ اب تو اُس کی آہیں سننے والا
بھی نہیں رہا تھا۔ وہ کچھ دن چنڈی گڑھ رہتا تو کچھ دن بیٹے کے پاس آ جاتا۔
جہاں بھی اُس کی پوسٹنگ ہوتی۔ وہ ایک ہی بات بار بار کرتا تھا۔ آپاں نوں شیرانوالہ
گیٹ لئے چلو۔ اک واری حویلی تے متھا ٹیکنا ہے۔ کئی دفعہ بیٹے نے باپو کو پاکستان
جانے کا مشورہ بھی دیا بلکہ ایک بار تو ننکانہ صاحب یاترا کے لیے ویزا بھی لگ گیا، مگر
عین وقت پر ہرمیت سنگھ کنی کترا گیا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ حویلی کی جو تصویر وہ سینے

سے لگا کے آیا تھا اُس کو بدلا ہوا دیکھے۔ سرجیت سنگھ باپو کے جذبات کو نہ تو سمجھ سکتا تھا نہ ہی ان جذبوں میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ وہ سیدھا سادہ انجینئر تھا۔ دو جمع دو چار۔ وہ جذبات سے عاری ایک سرکاری مشینری کا پرزہ بن کے رہ گیا تھا۔ اُس کے لیے باپ بس کریا کرم کے فرض سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا اور جو کوٹھی اُس نے چنڈی گڑھ میں بنائی تھی اُس سے بھی اُسے جذباتی وابستگی نہ ہو سکی۔ سرکاری کوٹھیوں میں رہنے کا عادی ہو گیا تھا۔ سرکاری نوکر۔ سرکاری ڈرائیور اس کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکے تھے۔ ہرمیت سنگھ اُٹھتے بیٹھتے بیٹے کو لاہور والی حویلی کا حدود اربعہ بتاتے نہیں تھکتے تھے۔ حویلی کی گلی میں حافظ تافتان باقرخانیاں کلچے اور کھنڈ کلچے لگاتا تھا۔ ہرمیت سنگھ اُس کے ذائقے تالو سے لگائے مزے لے لے کر حافظ کا ذکر کرتے تھے۔ اُس کے ساتھ پہلوان کی دکان تھی جس کے ہاں دہی چوبیس گھنٹے تیار ملتی تھی۔ دہی کے ساتھ پیڑے، فالودہ، ربڑی ملائی اور فیرنی کے لیے صبح شام بھیڑ بھڑ کا لگا رہتا تھا۔ پہلوان چھوٹے قد کا گول مٹول گونگا تھا جس کے تین اُس جیسے گول مٹول بیٹے تھے۔ پہلوان اشاروں سے کام چلا لیتا تھا گونگے پہلوان سے ہرمیت سنگھ کی دوستی تھی۔ وہ ہر روز شام کو ملائی پلیٹ پہ چینی ڈال کے ہرمیت سنگھ کو زبردستی کھلاتا تھا۔ کبھی کبھی ہرمیت حافظ سے کھنڈ کلچہ پکڑ کے ملائی کی پلیٹ سے کھا لیتا تھا۔ سرجیت سنگھ کے لیے باپ کی ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لگتا تھا باپ بیٹے سے نہیں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے۔ کبھی کبھی سرجیت شام کو فائلیں لے کر بیٹھ جاتا تھا اور باپو لاہور کی حویلی کو یاد کرتا رہتا تھا۔ سرجیت کو کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ جالندھر کی کون سی گلی کو بنانے کی پروپوزل آئی ہے اور وہ گلی ایک دم شیرانوالہ گیٹ سے جا کر مل گئی۔ اسی طرح سرجیت کو یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ کب جالندھر کی اناج منڈی اکبری منڈی میں تبدیل ہو گئی۔ فائل کے

صفحے خود بخود بدل جاتے تھے۔ اسی طرح باپو اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا۔ اب ریتو کالج سے یونیورسٹی پہنچ گئی تھی۔ چنڈی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ کیا ہوا سرجیت کا پریوار چنڈی گڑھ والی کوٹھی میں اُٹھ آیا۔ جب کہ جالندھر کی آخری پوسٹنگ میں ٹھیک ٹھاک سرکاری بنگلہ اس کے پاس تھا۔ اب وہ اکیلا جالندھر رہنے لگا اور ریتو اپنی ماں امرت کور کے ساتھ چنڈی گڑھ باپو کے پاس آ گئی۔ کچھ دن تو باپو کو بہت اچھا لگا لیکن اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کی حویلی اُس سے جدا کی جا رہی ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی بہو امرت کور کے سامنے حویلی کی یادوں کی پوٹلی نہیں کھول سکتا تھا۔ بس جلد ہی بستر سے لگ گیا۔ اور پھر غشی میں بڑبڑاتا رہتا تھا۔ سرجیت سیاں چھیتی آ۔ مینوں لہور لئے جا میں شیرانوالہ گیٹ دی حویلی متھا ٹیکنا ہے۔ اسی غشی میں چھٹی پر جالندھر سے سرجیت سنگھ آیا۔ تو باپو نے غشی میں اس کا ہاتھ زور سے بھینچ لیا اور وعدہ لیا کہ وہ سورگباشی ہو گیا تو سرجیت ہر حال میں لاہور جا کر وہ حویلی دیکھے گا۔ اُس کے نزدیک ننکانہ صاحب یا حسن ابدال جا کے متھا ٹیکنا اتنا ضروری نہیں جتنا شیرانوالہ گیٹ کی اُس حویلی پہ متھا ٹیکنا ضروری ہے اور پھر جیسے داستان گو داستان کہتے کہتے سو جاتا ہے ہرمیت سنگھ برنالہ بھی سو گیا۔ اپنی حویلی کے خواب و خیال میں کہیں دفن ہو گیا۔

سرجیت سنگھ برنالہ کو پنجاب کی حکومت نے ملازمت کے پینتیس سال پورے کر کے ریٹائر ہونے پر گلے میں ایک ہار ڈالا، ایک محکمے کی شیلڈ پکڑائی اور کھانا کھلا کے عزت سے گاڑی میں بٹھایا۔ وہ چنڈی گڑھ اس کوٹھی میں آ گیا جس کے مکینوں کو فن باغبانی نہیں آتا تھا۔ اُس اُداس کوٹھی میں اب وہ اپنی پتنی اور بیٹی ریتو کور کے ساتھ رہنے لگا۔ ریتو تو یونیورسٹی میں اپنا زیادہ وقت گزارتی تھی۔ سرجیت اپنی پتنی کے ساتھ اس نئی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چنڈی گڑھ عجیب شہر ہے۔ یہ اسلام آباد کی طرح

ریٹائرڈ لوگوں کا شہر نہیں ہے۔ یہ سروس کرنے والوں کا شہر ہے۔ اب اس کا اندازہ سرجیت سنگھ برنالہ کو نہیں تھا۔ وہ تو جالندھر، پٹیالہ، بٹالہ، ہوشیارپور، امرتسر، فیروزپور وغیرہ میں ملازمت کرتا رہا۔ جو سب شہر ایک جیسے تھے۔ وہ تو ساری زندگی میں بس دو ایک بار دلی تک گیا، وہ بھی کسی سرکاری کام سے۔ ایک آدھ بار بمبئی بھی گیا اور دو ایک بار لکھنؤ۔ بس یہی اس کی کل کائنات تھی۔ اُسے کچھ پتا نہیں تھا کہ لاہور کی زندگی کیسی ہوتی ہے اور اُس کا باپو ساری زندگی کس عذاب کو سہہ کے گزر گیا ہے۔ وہ ایک سرکاری افسر کی طرح صبح آٹھ بجے سے چار بجے تک دفتر کا ایک پرزہ بن کر رہتا آ رہا تھا۔ اب اچانک وہ گھر بیٹھ گیا۔ نہ نوکر، نہ ڈرائیور، نہ دفتر۔ اُس کی بیوی بھی اُسی کی طرح اس معمول کی عادی تھی۔ کہتے ہیں نا کہ جیسی روح ویسے فرشتے۔ جس ڈھنگ سے شوہر بیوی کو رکھتا ہے بیوی اُس کا سایہ بن جاتی ہے یا طلاق لے لیتی ہے۔ تو امرت کور نے طلاق نہیں لی جیسا شوہر نے بنایا بن گئی۔ نہ کوئی ویمن کلب جوائن کیا نہ کوئی رغبت باغبانی سے ہوئی کہ سرکاری مالی ہوتے تھے۔ نہ باورچی خانے میں کوئی دل لگایا کہ کھانا بنانے والے ہوتے تھے۔ وہ بس ایک فائل بن کے رہ گئی جس پر ہر رات یا دوسری تیسری رات شوہر دستخط کر دیتا تھا۔ وہ تین وقت کا کھانا بنانے کی پابند تھی اور دھوبی سے کپڑے دھلوانے کو اپنی زندگی کا مصرف سمجھنے لگی تھی۔ ایسے میں سرجیت سنگھ برنالہ آدھا دن اخبار پڑھتا رہتا تھا اور آدھا دن سونے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ سونے سے یاد آیا کہ اُسے خواب میں کئی دفعہ باپو نے ڈانٹ پلائی کہ اُس نے اُس کی وصیت کیوں پوری نہیں کی۔ وہ لاہور کیوں نہیں گیا اور شیرانوالہ گیٹ کے اندر اُس کی بنائی ہوئی حویلی پہ متھا کیوں نہیں ٹیکا۔ مگر اُسے کچھ پتا نہیں تھا کہ پاکستان جانے کے لیے ویزا کیسے لیتے ہیں اور کس طرح دو مخالف ملکوں میں اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ کہ ایک دن رتو سنگھ یونیورسٹی سے واپس

آئی تو اُس نے خبر سنائی کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان تعلقات بہتر بنانے کے لیے ویزے کے لیے نرمی پیدا کی جا رہی ہے۔ دونوں ملکوں کے سفارت خانے پھر سے شروع ہو رہے ہیں اور پھر مسلسل خبروں سے ثابت ہو گیا کہ دونوں ملکوں کی فوجیں سرحدوں سے پیچھے ہٹادی گئی ہیں اور دونوں ملک مسئلہ کشمیر سمیت تمام مسائل پر بات کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اس بات کا شیرانوالہ گیٹ کی حویلی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ سرجیت سنگھ برنالہ ان سب باتوں سے بے خبر تھا کیوں کہ وہ عجیب قسم کا سکھ تھا۔ نہ اس نے کبھی دارو پی، نہ اس نے کبھی سکھوں کے لطیفے سنے، نہ وہ کبھی کسی ایسی محفل میں گیا جہاں ناچ گانا ہوتا ہے۔ اس لیے جب اس کی بیٹی ریتو سنگھ نے باپ کو خبر سنائی کہ پاکستان میں بسنت ہو رہی ہے اور اس کے فوراً بعد انڈیا کی کرکٹ ٹیم پاکستان جانے والی ہے اور ہندوستان کے الیکشن بھی قریب ہیں۔ اس لیے ہندوستان اور پاکستان میں برابری اور بھائی چارے کا ماحول پیدا ہونے والا ہے۔ سرجیت خاموشی سے ریٹائرمنٹ کی عمر گزارنا چاہتا تھا کہ یکدم خاموش جھیل میں سیلاب آ گیا۔ ریتو سنگھ اور امرت کور کو لاہور نے لبھانا شروع کیا۔ باقی کی کسر ٹی وی چینلوں نے پوری کر دی جو دن رات پاک بھارت تعلقات کی بہتری کے لیے رطب اللسان ہو گئے۔ ایسے میں خبر بڑھی کہ چنڈی گڑھ سے کئی طرح کے گروپ لاہور جتھوں کی صورت میں جا رہے ہیں۔ کوئی اولڈ راویز کا جتھا تھا، کوئی وکیلوں کا، کوئی ڈونگی والوں کا، کوئی مذہبی یاتریوں کا تو کوئی بسنت پریمیوں کا۔ ایسے میں ریتو سنگھ نے اپنے پریوار کا ناکا فٹ کیا اور ایک جتھے میں اُن کو جگہ مل گئی۔ ویزے لگے اور اناری کے راستے ٹرین سے واہگہ پہنچ گئے۔ سرجیت سنگھ برنالہ ایک گم سم ریٹائرڈ انجینئر اس ساری صورتِ حال اور اس سارے کلچر سے بیگانہ بس باپو کی صورت دھیان میں رکھے لاہور میں اُتر گیا۔ معلوم نہیں شیرانوالہ گیٹ کہاں ہے۔ لاہور

کس اور ہے کس چھور تک پھیلا ہے۔ رتیو سنگھ اور اس کی ماں جب لاہور گھومنے نکلیں تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انہوں نے تو ایسے شہر کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ تو ساری زندگی چھوٹے شہروں میں سرکاری گھر بدلتی رہتیں اور رہ گیا چنڈی گڑھ تو اس کا اپنا تو کوئی کلچر اور کیریکٹر تھا ہی نہیں۔ تو اب ان کو محسوس ہوا۔ سردار ہرمیت سنگھ برنالہ کیوں آہیں بھرتا تھا۔ اُسے اتنے بڑے ثقافتی شہر سے نکال کر بنالے میں دھکیل دیا گیا۔ سرجیت بھی سوچنے لگا اس بٹوارے میں ان کے ساتھ واقعی ہاتھ ہو گیا۔ ساری ملازمت چھوٹے شہروں میں نکل گئی۔ اب جو بسنت کی رات لاہور کو دیکھا تو انہیں اپنی حکومت پر بے حد غصہ آیا جس نے سرحد پر فوجیں کھڑی کر کے انہیں اب تک لاہور سے محروم رکھا۔ رتیو سنگھ اور امرت کور لاہور کے کھانوں میں ایسی الجھیں کہ کوئی ہوش نہ رہا۔ کہاں کا شیرانوالہ گیٹ اور کہاں کی اکبری منڈی۔ ایک دو بار کہیں فوڈ اسٹریٹ جاتے ہوئے انہوں نے سرسری سا ذکر ضرور کیا، مگر اندر سے سب اپنے بزرگوں کی یادوں کو تالے لگائے گھومتے رہے۔ روزانہ دن رات دعوت پہ دعوت۔ لاہوریوں نے ایسے پروگرام ترتیب دیے کہ وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ اب جتنے متھے وتھے ٹیک ٹکا کے واپس جانے لگے۔ سرجیت سنگھ کو کسی شے کا شوق شغف تھا نہیں۔ اس لیے وہ حیران حیران پھرتا رہا کہ اچانک انہیں خیال آیا کہ واپسی کا دن قریب آ چکا ہے اور باپو کی وصیت اُسی طرح جیب میں پڑی ہے جیسے کسی ضروری کام کی چٹ جیب میں رکھی جاتی ہے۔ آخر رتیو سنگھ نے باپو کی ہمت بڑھائی کہ اندرون لاہور تو دیکھنا ہی ہے تو کیوں نہ شیرانوالہ گیٹ جا کر اُس حویلی کو دیکھ ہی لیں۔ چناں چہ جانے سے دو دن پہلے سرجیت سنگھ اپنے پریوار کے ساتھ شیرانوالہ گیٹ میں داخل ہو ہی گیا۔ پوچھنے پاچھنے کا کچھ خیال نہیں تھا بس چلتے رہے۔ گونگے پہلوان کی دکان راستے میں آئی تو سمجھ گئے منزل قریب ہے۔ گونگے پہلوان

کا پوتا وغیرہ ہوگا جو خود کوئی کام نہیں کر رہا تھا۔ گلے پہ بیٹھا تھا۔ بے شمار کارکن مصروف تھے۔ اب اس نے جلیبیاں بھی بنانی شروع کر دی تھیں۔ اندر بیٹھنے کی جگہ بھی صاف ستھری بنائی تھی۔ ساتھ کی دکان یا گھر خریدنے کے بعد اس نے کاروبار پھیلا دیا تھا۔ اب صبح حلوہ پوری بھی لگتی تھی۔ گوگے پہلوان کی بڑی بڑی تصویریں اندر آویزاں تھیں۔ ایک میں وہ پہلوانوں والی رنگین پگڑی باندھے گلے میں تصویر اور منکے ڈالے مسکرا رہا ہے۔ دوسری میں وہ کسی مقامی لیڈر کے گلے میں بازو ڈالے مسکرا رہا ہے۔ سرجیت سنگھ نظریں چرا کر یہ سب دیکھتا رہا کہ لوگ جمع ہو گئے۔ اندر سے پہلوان کے پوتے نے آواز لگائی۔ سردار جی، اندر آ جاؤ۔ کوئی لسی شسی، کوئی پیڑہ پوڑی، کوئی جلیبی شلیبی۔ ریتو سنگھ اس سارے ماحول سے گھبرا رہی تھی۔ سرجیت سنگھ وہاں سے آگے بڑھا تو گلی ایک منی فوڈ مارکیٹ کا نقشہ دے رہی تھی۔ دونوں طرف لوگوں نے گھروں کو دکانوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک یہ گلی مسلسل اپنا ناک نقشہ بدلتی رہی تھی۔ اب ایسے میں حویلی کو کیسے پہچانیں گے۔ لوگوں نے اپنے گھروں کے اگلے حصے میں دکانیں بنائی تھیں اور پچھلے حصوں میں خود رہ رہے تھے۔ خود کیا، ایک ہی گھر میں دس دس خاندان آباد ہو گئے تھے۔ سرجیت سوچ رہا تھا باپو نے کہاں حویلی بنوائی اور ہو سکتا ہے کہ اس حویلی میں بھی دکانیں بن چکی ہوں۔ ریتو بھی گھبرا رہی تھی جس حویلی کا خواب لے کر آئے تھے وہ تو انہیں نہیں ملے گی۔ اب انہیں تلاش تھی تو حافظ کی دکان کی جو نان، باقر خانیاں، کلچے اور کھنڈ کلچے لگاتا تھا۔ وہ دیکھتے جا رہے تھے ایک طرف نہاری کی دکان تو دوسری طرف برگر بنانے والا سڑک کے بیچوں بیچ چولہا رکھے کھڑا ہے۔ سرجیت سنگھ کو اپنے باپو کی روح کا دم گھٹتے ہوئے محسوس ہوا۔ البتہ ریتو سنگھ کے لیے یہ انوکھا تجربہ تھا۔ سرجیت نان اور کلچوں کو دیکھنے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا۔

ایک یخنی بیچنے والے کے پاس سے گزرتے ہوئے سرجیت نے سوچا کیوں نہ کسی سے پوچھ لیا جائے کہ اچانک گرم گرم نان اور کلچے تندور سے نکلتے ہوئے دکھائی دیے۔ بورڈ دیکھا تو اس پر اردو میں حافظ کلچہ ہاؤس لکھا نظر آیا۔ سرجیت اردو رسم خط سے واقف تھا۔ اس لیے فوراً سمجھ گیا کہ منزل قریب ہے۔ ایسے ہی اس نے اندر نظر ڈالی تو چار تندور لگے ہوئے تھے جن پر بہت سے نانبائی مصروف تھے۔ اور نان ڈھیروں کی تعداد میں نکلے آتے تھے۔ سرجیت نے بے تابی سے دو قدم آگے لیے تو منی فوڈ مارکیٹ اچانک ختم ہو گئی اور ایک حویلی کا گیٹ نظر آیا۔ اس پر میاں محمد صدیق کا نام سنگ مرمر پر کھدا ہوا تھا۔ حویلی کا ناک نقشہ تو وہی تھا مگر وقت نے اُسے چمک دمک سے محروم کر دیا تھا۔ دو درخت بہت اونچے اور پھیلے ہوئے باہر سے کسی حد تک حویلی کی عمارت کو چھپا رہے تھے۔ تینوں گم سم دروازے کے سامنے کھڑے رہے۔ سرجیت کو لگا جیسے اس کے باپو کی روح کہیں آس پاس بسیرا کیے ہوئے ہے۔ اس نے کانپتے ہاتھ سے بیل کا بٹن دبایا۔ اندر سے ایک ادھیڑ عمر شلوار قمیص میں ملبوس بھاری جسم والا آدمی باہر آیا۔ شکل سے رنگ محل کا تاجر یا اکبری منڈی یا برانڈرتھ روڈ کا دکاندار لگتا تھا۔ وہ چند لمحے ٹھٹکا، جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ''آپاں چنڈی گڑھ توں آئے ہاں'' سرجیت نے ہاتھ ملایا۔ ''تسی کنوں ملن آئے ہو۔'' یہ جملہ کافی دیر ہوا میں تیرتا رہا۔ واقعی وہ کس سے ملنے آیا ہے۔ باپو سے یا اُس کی روح سے۔ چند لمحے بعد اُس نے اپنا تعارف کرایا تو اُس آدمی کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے کہا بہت اچھے موقعے پر آئے ہیں۔ بس آپ کی ہی کمی تھی۔ اس بات کی سرجیت کو سمجھ نہ آئی۔ جب وہ اندر گئے تو حویلی کے بیچ ایک سنگ مرمر کا فوارہ نظر آیا جسے سب نے فوراً پہچان لیا۔ لکڑی کا کام اگرچہ اب وہ نہیں رہا تھا۔ تاہم کثرت استعمال اور بدذوقی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اندر پانچ سات مختلف عمروں کے لوگ صحن میں کھڑے تھے۔

جب یہ لوگ اندر پہنچے سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ بچے اور عورتیں اندر سے جھانکنے لگیں۔ ایک آدمی نے ہاتھ میں فیتہ تھام رکھا تھا، دوسرے کے ہاتھ میں چونے کا برتن تھا۔ جو آدمی ان کو اندر لے گیا وہ میاں محمد صدیق کا بیٹا میاں رفیق تھا اور جو لوگ صحن میں کھڑے تھے ان میں میاں محمد صدیق کا دوسرا بیٹا میاں محمد شفیق بھی تھا اور دو تین نوجوان تھے جوان دونوں کے بیٹے ہو سکتے تھے۔ میاں رفیق نے اطلاع دی کہ یہ حویلی پاکستان بننے سے پہلے اس کے والد سردار ہرمیت سنگھ برنالہ نے بنائی تھی جس کے نام کا سنگ مرمر اکھاڑ کے میاں محمد صدیق کا پتھر لگایا گیا تھا۔ آؤ جی آؤ دیکھ لوا پنے بزرگوں کی حویلی۔ سرجیت تو پتھر کی سل ہو چکا تھا۔ اُسے محسوس ہوا اس کے باپو کی روح کو ان لوگوں نے گھیر لیا ہے۔ اتنے میں وہ آدمی بولا جس نے فیتہ اٹھار کھا تھا۔ او جی ذرا جلدی کرو۔ نیم لنگھ ریا اے۔ میاں شفیق نے کہا۔ اس وقت ہم ذرا مصروف ہیں آپ کو چائے پانی نہیں پوچھ سکتے۔ مگر ان لوگوں کو تو اور کچھ نہیں کرنا تھا۔ رسم پوری کرنی تھی۔ باپو کی وصیت پر عمل کرنا تھی سو وہ ہو چکا تھا مگر یہ فیتہ؟ آخر فیتے والے نے فیتے کا ایک سرا شفیق کو پکڑایا اور دوسرا سرا لے کر حویلی کے وسط میں دیوار تک چلا گیا۔ آؤ بالے چل حد بندی کے لیے چونا ڈالتا جا۔ وہ چونا ڈالتا گیا۔ حویلی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ فوراً آدھا ایک حصے میں آیا تو آدھا دوسرے حصے میں۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا، سرجیت حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ آخر محمد رفیق نے اس کو چونکایا۔ ''سردار جی گل اے وے جوائے حویلی ساڈے ابا جی توں بعد میرے تے میرے بھرا دے حصے وچ آئی۔ اسی دوئیں فیملی کٹھے رہے آں، مگر ہن بھا شفیق نے ڈیفنس کوٹھی پا لتی اے۔ او آپڑاں حصہ وکھ کرنا چاہندا اے۔ تے او نے اپنے دکاناں پانیاں نے اسی فی الحال ادھے ادھے حصے وچ رہواں گے۔ ایس لئی حویلی دی ونڈ ہو رئی ہے۔'' حویلی کا بٹوارہ ہو رہا تھا۔ سرجیت سنگھ نے دیکھا اس کے باپ کی روح اس

سفید لکیر پہ دو حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ایک بٹوارہ اس کے باپو نے دیکھا اور ساری زندگی آہیں بھرتا رہا اب دوسرا بٹوارہ وہ دیکھ رہا تھا۔ اسے لگا جیسے پنجاب ایک بار پھر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں کب وہ اس حویلی سے نکلے کب وہ بازار سے گزرے اور کب اپنے باپو کی روح کی لاش سینے سے لگائے واہگہ کے راستے اٹاری پہنچ گئے۔ اس کے بعد اس کے باپو کی روح کبھی اس کے خواب میں نہیں آئی۔

☆☆☆

المعروف..... بگھیلے شاہ

غوث بخش المعروف بگھیلے شاہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ جب اُسے یہ پتہ چلا کہ یوں اچانک بیٹھے بٹھائے اُس کی عرفیت کو ایک سماجی تحفظ اور معاشرتی مقام مل گیا ہے۔ کئی برسوں سے وہ جس احساسِ کمتری میں گھل رہا تھا وہ ایک ہی پل میں احساسِ برتری میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس کا اُسے اندازہ ہی نہیں تھا۔ اب وہ اپنی عرفیت کا نہ صرف اعلان کر سکتا تھا بلکہ اُس پر فخر بھی کر سکتا تھا اور اُس نے ایسا ہی کیا کہ سب سے پہلے اپنے وزیٹنگ کارڈ چھپوائے جن پر خفی حروف میں غوث بخش اور جلی حروف میں المعروف بگھیلے شاہ لکھوایا۔ پھر اُس نے ٹین کا ایک بڑا بورڈ بنوایا جس پر ایسے ہی اپنا نام تحریر کرایا اور اُسے اپنے بنگلے کی دیوار پر لگایا کہ دروازے پر وہ بورڈ آ نہیں سکتا تھا۔ اس طرح اُس نے سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا بلکہ تقریر کرنا بھی شروع کر دیا لیکن اس کی تفصیل سے پہلے غوث بخش کا حدود اربعہ جاننا ضروری ہے۔

بگھیلے شاہ ایسے سید گھرانے کا چشم و چراغ تھا جو بوجوہ اپنے سید ہونے کا اعلان معذرت خواہانہ انداز سے کیا کرتے تھے اور بگھیلے شاہ کی پیدائش سے اُس کے والدین کو چنداں دلچسپی نہیں تھی کہ وہ ان کی دسویں گیارہویں اولاد تھا۔ اسی سبب اُس

کی کچھ تو شکل بگھیلوں والی تھی اور کچھ عدم دلچسپی کے باعث اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کا جھول پیدا ہو گیا تھا۔ جس نے اُس کے بگھیلے ہونے کی راہ ہموار کر دی۔ چھوٹی عمر ہی سے وہ اپنے بزرگوں اور خاندان کے بڑوں کی ان محفلوں میں شریک ہونے لگا تھا جن میں بڑے اہتمام سے بھنگ گھوٹنے اور سردائی بنانے کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ بگھیلے شاہ کی کل کائنات وہ ڈیرہ تھا جہاں شام سے پہلے اُسے کچی مٹی پر پانی کا چھڑکاؤ اس طرح کرنا ہوتا تھا کہ پانی کا ایک قطرہ بھی مٹی کے مساموں پر اُبھرا ہوا نظر نہ آئے اور نہ ہی زمین پر ایک انچ کا حصہ بھی خشک رہ جائے۔ یہ ایک خاص تکنیک ہوتی تھی جو شوق لگن اور تجربے سے بگھیلے شاہ نے حاصل کی تھی۔ وہ سارا دن یا تو گلیوں میں پھرتا رہتا یا دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھا رہتا یا بڑے پیپل کے درخت کے نیچے بنٹے کھیلنے والے لڑکوں کو دیکھتا رہتا۔ شام ہونے سے پہلے وہ اپنے کام پر آ جاتا۔ چھڑکاؤ کے بعد وہ کھجور کے پتوں کی چٹائی بچھاتا۔ پھر کہیں سے مولائی اور کربلائی پیر چوٹی شاہ اپنے ساز لے کر آ جاتے۔ چوٹی شاہ کو اس لیے چوٹی شاہ کہتے تھے کہ بچپن میں اُس کے والدین نے منت مانی تھی کہ اگر بیٹا ہوا تو اُس کی چوٹی کربلا معلی میں جا کر اُتروائیں گے۔ بیٹا تو پیدا ہو گیا اور چوٹی بھی رکھ دی گئی۔ لیکن والدین کو توفیق نہ ہو سکی کہ کربلا جا سکیں۔ اس میں عراق سے تعلقات کو کوئی خاص دخل نہیں تھا۔ چنانچہ وہ چوٹی بڑھتے بڑھتے اب کمر کو چھونے لگی تھی۔ چوٹی شاہ ڈنڈا دورا لے کر آ جاتا اور دیگر ساز و سامان بگھیلے شاہ مہیا کرتا۔ بگھیلے شاہ کی عمر ابھی بارہ تیرہ سال ہی تھی لیکن وہ اس محفل کے تمام آداب سے واقف تھا۔ ادھر چوٹی شاہ مولا علی کا نعرہ لگا کر دورے میں سبز پری اور دیگر جڑی بوٹیوں کو رگڑنا لگاتا اور اُدھر سے محفل کے شرکا اپنی اپنی پگڑیاں زمین پر گھسیٹتے اور سنبھالتے ہوئے۔ اپنے تہمد کی ڈبوں کو اُڑستے ہوئے آنا شروع

ہو جاتے۔ اُن لوگوں کی آمد کا اعلان مختلف طرح کی بے حد لذیذ اور اچھوتی گالیوں سے ہوتا جو وہ اپنی خوشی کو ظاہر کرنے کے لیے ادا کرتے۔

بگھیلے شاہ کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ دورے کو اچھی طرح پکڑ کر بیٹھے تاکہ ترنگ میں آئے ہوئے چونی شاہ کے رگڑے سے دورا پھسل نہ جائے۔ اس دوران بگھیلے شاہ کی تمام تر توجہ ان بزرگوں کی مقفیٰ مسجع اور اسم مکبّر سے بھرپور تازہ تخلیق کی ہوئی گالیوں پر رہتی تھی۔ وہ ان گالیوں کا نشہ کرنے لگا تھا۔ ان گالیوں کی ادائیگی جس مہارت سے کی جاتی تھی اُس سے بگھیلے شاہ کے احساس اور ذوق کی تسکین ہوتی تھی۔ عجیب و غریب ہیولے اور آپس میں گڈمڈ ہوتے ہوئے پیکر اُس کے تصور میں گھومنے لگتے اور وہ محسوس کرتا کہ جیسے سانپ کا چمکتا ہوا بچہ اُس کی ریڑھ کی ہڈی کے اندر سرسراتا ہے۔ بگھیلے شاہ بڑے بڑے پیتل کے کٹورے بھر بھر کے چارپائیوں پر ایک دوسرے کے سہارے لیٹے ہوئے ان بزرگوں تک پہنچاتا۔ پھر کئی قسم کے نعرے لگتے جن میں سب سے بڑا نعرہ پیر مرشد یا علی کا ہوتا اور آخری نعرہ سب مل کر لگاتے ''ساوی سب پر حاوی'' (سبز پری سب پر حاوی ہو جاتی ہے) دو دو چار چار کٹورے پینے کے بعد محفل اپنے رنگ پر آجاتی اور اسی کا بگھیلے شاہ سارا دن انتظار کرتا رہتا تھا۔ دراصل غوث بخش کا نام بگھیلے شاہ بھی اسی محفل میں پڑا تھا۔ پہلی بار کسی نے اُسے آواز دی جو اُس نے نہ سنی اُدھر کٹورا خالی تھا۔ تو صاحب کٹورا نے غصے میں دوبارہ آواز دی اور ساتھ ہی یہ نام بھی رکھ دیا اور کہا ''اوئے بگھیلے شاہ تجھ سے چلا نہیں جاتا بگھیلا نہ ہو تو۔ اور پھر بہن کی پُرتکلف گالی دے کر کٹورا اُس کی طرف پھینکا۔ بگھیلے شاہ بال بال بچ گیا۔ لیکن نام اُس پر چپک گیا۔ جب محفل رنگ پر آتی تو چونی شاہ اُس دورے میں منہ رکھے چٹائی پر ایسے مدہوش ہو کر گر جاتا کہ اُس کی چادر ہوا میں اِدھر اُدھر ہو جاتی اور

اُسے پتہ بھی نہ چلتا کہ اُس کی جمع پونجی نمائش کے لیے باہر آ جاتی۔

بگھیلے شاہ خاموش اس محفل کا لطف اُٹھاتا جس میں ہر آدمی اپنی اپنی بولی بول رہا ہوتا۔ مستر شاہ سلوموشن میں گالیاں دے رہا ہوتا اور ایک ایک لفظ کو کھینچ کھینچ کر ادا کرتا۔ روڑے شاہ رونے لگتا اور پھر روتے روتے زمین پر ہاتھ مارنے لگتا۔ پھر گر پڑتا۔ خاصے خان کا معمول تھا کہ وہ چپ سادھ لیتا۔ آنکھیں بند رکھتا اور ایک جگہ ایسے ساکت ہو جاتا جیسے کوئی مجسمہ ہو۔ لیکن اچانک اتنی زور سے یا پیر دستگیر کا نعرہ لگاتا کہ دورے میں منہ رکھ کر سویا ہوا چونی شاہ جھرجھری لے کر اٹھتا اور پھر ایک ہی لمحے بعد واپس اُس دورے میں منہ رکھ دیتا۔ لیکن ان سب سے دلچسپ آئٹم نجف شاہ کا تھا۔ وہ اپنی چارپائی پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا اور مجلس شامِ غریباں شروع کر دیتا۔ بگھیلے شاہ کو اسی آئٹم کا انتظار رہتا تھا۔ وہ زمین پر آلتی پالتی مار کے اکیلا سامع بن جاتا اور نجف شاہ بیان شروع کرتا۔ سوز خوانی کے انداز میں اپنی کھرج والی آواز کے اُتار چڑھاؤ میں مولا کی شہادت کا بیان بین اور فریاد کے ملے جلے انداز سے کرنے لگتا۔ اس دوران اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ آواز گلے میں رندھ جاتی وہ اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنے زانوؤں پر مارتا پھر اپنے سینے پر مارتا پھر اپنے سر پر مارتا۔ پگڑی کے پیچ کھل کر گلے میں آ جاتے اور نجف شاہ دھاڑیں مار مار کر عورتوں کی طرح رونے لگتا۔ اکیلا سامع بگھیلے شاہ گم سم۔ پتھر بن کر اُسے تکتا رہتا۔ نجف شاہ شامِ غریباں برپا کرنے کے بعد سر اٹھاتا اور کہتا۔ کربلا ہے۔ سب کربلا ہے۔ میں کربلا ہوں۔ ہم سب کربلا میں ہیں۔ ڈھول اُڑ رہی ہے۔ لوگو اٹھو یہ کربلا ہے۔ ہم سب کربلا میں ہیں اور پھر وہ سر کو اپنے ایک ساتھی کی کمر پر گرا دیتا۔ جو وہیں پڑا ہوا ہوتا۔ بگھیلے شاہ کو وہ شام، شامِ غریباں لگتی۔

ہر روز ایک شام غریباں سے گزرنے کا تجربہ کرتے ہوئے بگھسیلے شاہ کو لگتا وہ جلے ہوئے خیموں کے دھوئیں میں بیٹھا ہوا ہے۔ رات کے مختلف حصوں میں وہ بزرگ اُٹھتے اور گرتے لڑکھڑاتے ہوئے اپنی اپنی پگڑیوں کو گلے میں ڈالے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔

بگھسیلے شاہ کا لڑکپن ایسے ہی گذرا۔ وہ لڑکپن سے کیسے جوانی میں داخل ہوا یا جوانی میں بھی لڑکپن کو کیسے قابو کیے رہا۔ یہ کسی کو پتہ نہ چل سکا کیونکہ بگھسیلا لوگوں کے لیے کارپوریشن کے نلکے کی طرح تھا جو وقت پڑنے پر آتا ہے اور وقت پر چلا جاتا ہے۔ اُس کی کوئی شخصیت نہیں تھی۔ وہ گلی کے نکڑ پر لگے مٹی کے تیل کے لیمپ کی طرح تھا جسے ہر شام سیڑھی بردار آدمی آ کر جلا جاتا تھا۔ بگھسیلے شاہ کو ایسے لگتا تھا جیسے وہ شام غریباں میں گھوم رہا ہے۔ اُس کے ہر طرف دھواں پھیلا ہوا ہے۔ بگھسیلے شاہ کا خانوادہ زمینداری کرتا تھا اور کبھی کسی نے یہ نہ سوچا کہ زندگی میں ترقی بھی اس وسیلے سے کی جا سکتی ہے۔ آہستہ آہستہ شہر پھیلتے پھیلتے اُن کی زمینوں تک پہنچ گیا اور انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔

بگھسیلے شاہ کے حصے میں دو مربع زمین آئی اور شہر کا خوبصورت حصہ اُس کی زمینوں کے پاس ہاتھ پھیلائے پہنچ گیا۔ جس طرح منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ ایک دن پہلے ہندوستان میں تھا اور دوسرے دن پاکستان میں آ گیا تھا ایسے ہی جو زمین ایک دن پہلے زرعی تھی دوسرے دن کارپوریشن کی حدود میں آ گئی۔ اب بگھسیلے شاہ صرف بگھسیلے شاہ نہیں رہا تھا۔ اب وہ غوث بخش المعروف بگھسیلے شاہ بن گیا۔ لیکن اب اس کا احساس کمتری اور نمایاں ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنا ایک چھوٹا سا ڈیرہ بھی بنا لیا تھا۔ جہاں وہ کالی پیچ دار پگڑی کھول کر گلے میں ڈالے سیاہ کرتا پہنے حقہ کھینچتا رہتا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آتی

تھی کہ وہ کون سا پیشہ اختیار کرے۔ نجف شاہ اُس کے لاشعور میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے ذاکری اور سوز خوانی اُس کا آئیڈیل پیشہ تھا۔ لیکن اُسے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کیسے اچانک خم ٹھونک کر میدان میں اُتر آئے۔ اور اعلان کر دے کہ میں ذاکر بن گیا ہوں۔ اگرچہ مارکیٹ میں ذاکروں کی کمی نہیں تھی اور اُس کے لیے کسی خاص عقیدے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ گلا اچھا ہو، تربیت ہو تو کیا سنی کیا شیعہ۔ کیا احمدی۔ مولا کا غم تو ہر ایک کے لیے یکساں تھا۔ ذاکر بننے میں رکاوٹ نہیں ہو سکتی تھی۔

شروع شروع میں لوگوں نے بُکھیلے شاہ کو فقیری طبیعت کا سمجھ کر تعویذ لینے کی کوشش بھی کی لیکن بُکھیلے شاہ کے ہاتھ میں برکت یا اثر نہیں تھا۔ اس لیے کرامت کا کوئی واقعہ نہ تو مشہور ہوا اور نہ ہی اُس کا ایسا کوئی مرید پیدا ہوا جو ایک آدھ کرامت اُس کے حصے میں ڈال دیتا اور عام کر دیتا۔ چنانچہ بُکھیلے شاہ اس میدان میں ناکام ہو گیا۔ اب اُس نے ایک سوز خواں پارٹی تک رسائی حاصل کر لی اور اُن کے ساتھ مجالس میں جانے لگا۔ اُس کا کام پیچھے آواز لگانا تھا۔ وہ پیسے کے لالچ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنا کوئی مقام بنانا چاہتا تھا۔ یا اپنا مصرف ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ شام غریباں کا حصہ بننے کے لیے ایسا کر رہا تھا۔

اب وہ پارٹی میں شامل ہو گیا تھا۔ گلے میں پگڑی کے پیچ کھول کر ڈالے ہوئے وہ سر لگاتا۔ آواز ملاتا۔ کسی تازہ فلمی دھن کے مطابق لے اور للک کے داؤ پیچ استعمال کرتا اکثر ایسا ہوتا کہ جب پارٹی لیڈر کسی نئے فلمی گیت کی نقل تیار کرنے کے لیے محفل لگاتا تو اس محفل کا چائے پانی بُکھیلے شاہ کے ذمہ ہوتا۔ پہلے اس تازہ اور مقبول فلمی گیت کا کیسٹ سنا جاتا اور کئی کئی بار سنا جاتا پھر اس کے مطابق پارٹی لیڈر بول تیار کرتا یا پہلے سے موجود بول اس میں ڈھالے جاتے۔ پھر سب اس میں مل کر آواز

ملاتے اور نیا آئٹم تیار ہو جاتا یہ نیا آئٹم جب پہلی بار مجلس میں پیش کیا جاتا تو مجمع بے حال ہو جاتا۔

شروع شروع میں بگھیلے شاہ کو فلمی طرزوں پر مقدس ہستیوں کا ذکر کرنا پسند نہیں تھا۔ لیکن جب یہ دستور بن گیا تھا اور جب حاضرین کی داد برستی تو اُسے یوں لگتا کسی نے اُس کے خون میں پھونکنی سے پھونک ماردی ہے۔ اگرچہ مجالس میں دائیں جانب مستورات کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی تھی اور مستورات ذاکروں اور سوزخوانوں کو اچھی طرح دیکھ سکتی تھیں۔ لیکن اُس نے کبھی عورتوں کی طرف دیدہ بازی کے انداز میں نہیں دیکھا تھا۔ لیکن سوزخوانوں کی نجی محفلوں میں ہر سوزخواں اپنی اپنی پسندیدہ سامع کا ذکراور اتے پتے کمل کے بیان کرتا تھا۔ ایک دو تو اپنی کامیابی کا اعلان بھی کر چکے تھے۔ اس بات سے بگھیلے شاہ کافی بددل ہوا تھا۔ اگرچہ اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی اُسے ایسے لگا جیسے یہ لوگ اپنے مذموم مقاصد کے لیے اس مقدس پیشے کو استعمال کر رہے ہیں۔

پھر ایک دن یہ ہوا کہ پارٹی لیڈر کا نائب ایک عورت بھگا کے سیدھا پارٹی کے صدر دفتر میں عین اس وقت آ گیا جب سب مل کر ملکہ ترنم نور جہاں کے تازہ گیت پر مرثیہ تیار کر رہے تھے۔ پارٹی لیڈر نے کفِ افسوس ملا کہ یہ دان اُس کی نظر سے کیوں اوجھل ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے نائب کو لعن طعن کی اور نقاب پوش عورت سے اکیلے میں بات کرنے کا حکم دیا۔ پارٹی کا صدر دفتر خالی ہو گیا اور پھر ایسا ہوا کہ پارٹی لیڈر اُس خاتون کے ساتھ ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔ اب پارٹی کمان اُس نائب کے ہاتھ میں تھی جو اپنی بیوقوفی سے اپنی محنت کی کمائی دوسرے کے ہاتھ میں دے بیٹھا تھا۔ زیادہ دیر نہیں لگی کہ اُسی سیزن میں نائب بھی کامیابی سے ہمکنار ہوا اور ایک برقع پوش

اُس کے گھنگھریالے بالوں میں اٹک گئی۔ جن پر وہ روزانہ دھنیئے کا تیل لگاتا تھا۔ ہوتے ہوتے ایک دن بکھیلے شاہ پارٹی لیڈر بن گیا۔ اُس نے کئی قسم کی اصلاحات نافذ کیں۔ اور نئی بھرتی کے نوجوانوں پر کڑی نگاہ رکھنے لگا۔ البتہ فلمی گیتوں کی طرز پر دھنیں بنانے سے اپنی پارٹی کے لوگوں کو نہ روک سکا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ وہ ذاکری سے فارغ ہو کر آستانہ گل محمد کے ساتھ ایک حجرے میں بیٹھا چیتل کا کٹورا پی رہا تھا کہ ایک خاتون سیاہ برقعے میں اندر آئی۔ اندر اندھیرا تھا۔ اُس خاتون نے نقاب اُلٹی تو اُجالا ہو گیا۔ دن نکل آیا۔ بکھیلے شاہ کی آنکھوں میں سرمہ اور چمکنے لگا۔ اُس خاتون نے کہا " میں گزشتہ چھ ماہ سے تمہاری ہر مجلس آگے بیٹھ کر سن رہی ہوں۔ تم نے کبھی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔"

بکھیلے شاہ نے کہا " شاید اس لیے آنکھ نہیں اُٹھائی کہ دوبارہ آنکھ اُٹھانے کے قابل نہ رہتا۔ اب چونکہ آنکھ اُٹھ چکی ہے تو بتاؤ کدھر کا ارادہ ہے۔" اس طرح بکھیلے شاہ نے اپنی شاہی اپنی گدی اور اپنی پارٹی چھوڑی اور گھر آ گیا۔ وہ خاتون ایک ایک کر کے اُس کے بچوں کی ماں بننے لگی اور بکھیلے شاہ نے اُس کا مجلس میں جانا بند کر دیا۔ خود بکھیلے شاہ بھی گوشہ نشین ہو گیا۔ کبھی کبھی اُسے خیال ضرور آتا کہ وہ دوبارہ اپنی پارٹی بنائے اور مجلسوں میں جائے لیکن اس واقعے کا ہر آستان پر بہت شور ہوا تھا۔ اس لیے بکھیلے شاہ کو دوبارہ جگہ بنانے کے لیے جس محنت کی ضرورت تھی۔ وہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جو اُس کے بچوں کی ماں بنتی چلی گئی تھی وہ آستانے کے متولی کی بیٹی تھی۔

وہ گم سم اپنے ڈیرے پر پڑا رہتا تھا۔ لیکن جس کی دو مربعے زمین شہر میں آ جائے وہ کب تک یوں پڑا رہ سکتا ہے۔ اب اُن دو مربعوں کے اردگرد کافی آبادی ہو گئی تھی۔ بعض نئی رہائشی سکیمیں بھی آس پاس پر پھیلا رہی تھیں۔ اس لیے پراپرٹی

ڈیلروں اور پاکستان میں اُبھرتے لینڈ مافیا نے اُس کے ڈیرے پر چھتہ بنانا شروع کر دیا۔ عجیب و غریب قسم کی واسکٹوں اور جناح کیپوں میں پراپرٹی ڈیلر اپنی چرب زبانی کا مظاہرہ کرنے پہنچ جاتے۔ بُھسیلے شاہ خاندانی آدمی تھا وہ چیزوں کو بیچنے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ لیکن گذراوقات کے لیے وہ ایک دو دُکانیں کرائے پر اُٹھانے کے لیے بنانے کے حق میں تھا۔ ہوتے ہوتے ایک مارکیٹ کھڑی ہو گئی۔ وہ اُس کا مالک بن گیا۔ جب بازار اور چوڑا ہوا اور اُس طرف سے کئی شہروں کو بڑی سڑک بھی نکل گئی تو بُھسیلے شاہ ایک پٹرول پمپ کا مالک بھی بن گیا۔ کچھ شوروم بھی اُس نے بنالیے۔ شادی ہالز کا ملک میں نیا نیا رواج پڑا تو بُھسیلے شاہ نے اُسی بڑی سڑک پر ایک میرج ہال بنا دیا اور ایک مقامی ادیب سے اُس کا اچھا سا نام تجویز کرایا۔ اس طرح اس کا نام ''بندھن میرج ہال'' رکھا گیا مگر یہ سب کچھ ایک مشیر کی مدد سے ممکن ہوا جو شروع شروع میں پراپرٹی ڈیلر کے روپ میں آیا اور پھر بُھسیلے شاہ کا اعتماد حاصل کر کے صرف اُسی کی پراپرٹی ڈیل کرنے لگا۔ وہ بہت چالاک اور سوشل نیٹ ورکنگ کا ماہر تھا۔ ہر بڑے افسر اور بڑے سیاست دان کے قریب آنے کا ہنر جانتا تھا اور اس طرح اُس نے اپنی ایک البم بنالی جو موقع بے موقع لوگوں کو دکھاتا رہتا تھا۔ جس میں نامور اور مشہور لوگوں کے ساتھ اس کی تصاویر چسپاں تھیں۔

اب بُھسیلے شاہ نے ایک خوبصورت کوٹھی بھی بنالی۔ لیکن وہ اپنے احساس کمتری کو دور نہ کر سکا جو غوث بخش المعروف بُھسیلے شاہ کی وجہ سے تھا۔ مقامی ادیبوں نے مشورہ دیا کہ اپنا نام جی۔بی شاہ رکھ لے لیکن بُھسیلا تو گویا اُس میں سے باہر نکلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اُس کے پاس اب سب کچھ تھا لیکن اُس کے عرف کو سماجی تحفظ اور مقام حاصل نہیں تھا۔ اگرچہ اب ادبی انجمنوں کے عہدیدار فلمی ایوارڈ دینے والے کن ٹٹے اور

سماجی تنظیموں کے نام پر کاروبار کرنے والے اس کے گرد منڈلانے لگے تھے۔ وہ اپنے خصوصی فنڈ سے ان کی مدد بھی کرتا۔ لیکن اُسے اس بات کا قلق تھا کہ وہ کسی بھی انجمن کے جلسے میں مہمان خصوصی بننے کے لائق نہیں تھا۔ کیونکہ جس نام کے ساتھ المعروف لگا ہو لوگوں میں اس کی شان نہیں بن سکتی۔ شاید اس لیے کہ اس طرح کے نام صرف تھانوں اور اخباروں کے جرائم کی خبروں کے صفحے پر نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً شاہد عرف شیدا ڈبی۔ اسلم عرف چھرا۔ قادر عرف کالیا۔ طاہر عرف شیش ناگ۔ انور عرف بھیڈ۔ عارف عرف متھے بھن۔ جاوید عرف کن ملا بد معاش وغیرہ۔ بکھیلے شاہ اس غم میں گھلنے لگا حالانکہ اب وہ ایک سینما کا مالک بھی تھا اور اُس نے ایک آستانہ عالیہ جس پر سیاہ رنگ کا بڑا جھنڈا لہرتا تھا بنالیا تھا۔ ہر محرم میں باقاعدہ یہاں مجالس کا انتظام کیا جاتا تھا۔ سبیل لگتی تھی اور ایک تبرک تقسیم ہوتا تھا۔ البتہ اب عورتوں کی مجالس کا الگ اہتمام کیا جاتا تھا۔ اور عورتوں میں ذاکرین کے بجائے باجی فضیلت، آپا نگہت اس قسم کچھ ایسی باجیاں ذکر کی محفلوں میں سوز خوانی کرتی تھیں۔ جو یا تو بیوہ ہوتیں یا مطلقہ یا جن کی شادی کی عمر گزر چکی ہوتی۔

بکھیلے شاہ کے کئی دفتر کئی ٹیلی فون، کئی منیجر اور کئی گاڑیاں تھیں۔ وہ شہر کا اُبھرتا ہوا دولت مند تھا۔ جس کے پاس پہلا موبائل فون بھی اُس زمانے میں آیا تھا۔ بکھیلے شاہ نے کئی بار کوشش کی کہ وہ اپنے نام پر عرفیت کو کھرچ ڈالے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ اس غم میں اس کا سماجی اعتبار کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ کہ ایک دن حکومت نے بلدیاتی انتخابات کا اعلان کر دیا۔ بکھیلے شاہ کو یہ بھی پتہ تھا کہ ہماری حکومتیں اتنی کمزور ہوتی ہیں کہ بلدیاتی انتخابات کا اعلان کبھی بھی حتمی نہیں ہوتا اور عام طور پر اس چکر میں سال دو سال لگ ہی جاتے ہیں۔ بکھیلے شاہ اپنی نئی پراڈو گاڑی میں موبائل

فون پر اپنے کسی منیجر سے بات کرتے ہوئے شہر کی بڑی سڑک سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک دیوار پر پڑی جس پر بہت ہی جلی حروف میں لکھا تھا:

''محمد اکرم گجر المعروف چھوٹا پہلوان امیدوار کونسلر حلقہ 318''

یہ دیکھتے ہی ٹکھیلے شاہ کا ماتھا ٹھنکا۔ ذرا اور آگے گیا تو ایک سکول کی دیوار پر اُسی طرح لکھا ہوا تھا۔ ''خلیفہ خدا بخش المعروف سیانوالی سرکار'' اب ٹکھیلے شاہ کے اندر فوارے چلنے لگے۔ ذرا اور آگے گیا تو اُس نے دیکھا کونسلر کے امیدوار کا نام چھوٹا اور المعروف زیادہ جلی حروف میں لکھا گیا۔ یوں اچانک ٹکھیلے شاہ کو اپنی عرفیت کا سماجی تحفظ ملنے کی اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی اچانک ایک دن اُسے اپنی زمین کے کارپوریشن کی حدود میں شامل ہونے پر ہوئی تھی۔ اُسے یوں لگا جیسے صدیوں کی بے معنی عرفیت کو کارپوریشن کی حدود میں شامل کرلیا گیا ہو۔ وہ اپنی کوٹھی میں پہنچا اس کے پاؤں نہیں ٹکتے تھے۔ تب اُس نے اپنے نئے وزیٹنگ کارڈ چھپوائے اور بڑا بورڈ اپنی کوٹھی پر لگوایا۔ لیکن معاملہ یہاں تک تو نہیں رُک سکتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے شہر کی ساری دیواریں بلکہ پنجاب کے شہروں کی دیواریں المعروفوں سے سیاہ ہوگئیں۔ کونسلر شپ کے تمام امیدوار اپنے اصلی ناموں کے ساتھ عرفیت کا ڈھنڈورا پیٹنے لگے۔ اُن کی دیکھا دیکھی جو سیدھے سادے ناموں والے اُمیدوار تھے انہوں نے اپنے بچپن کی عرفیت کا سہارا لیا۔ اس طرح کوئی کاکا، کوئی ننھا، کوئی گڈو، کوئی بالا بن کر سامنے آ گیا۔ یوں تھانوں میں لگے ہوئے مجرموں کی فہرستوں والے بورڈوں پر لکھے ہوئے نام ان دیواروں پر آ گئے۔ ٹکھیلے شاہ کے پاس تو جینوئن قسم کی عرفیت تھی۔ اس موقع پر اُس سے فائدہ نہ اٹھانا تو کوئی عقلمندی نہیں تھی۔ جب دو نمبر مال مارکیٹ میں آ جائے تو ایک نمبر مال کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے اس

لیے بگھیلے شاہ نے اپنے مشیر کو بلایا اور اعلان کیا کہ وہ کونسلر کا الیکشن لڑنا چاہتا ہے۔ مشیر نے غور کے بعد مشورہ دیا کہ آپ جس مرضی حلقے سے الیکشن لڑیں آپ کو حکمران جماعت کی آشیر باد ضرور حاصل کرنی ہوگی۔ ورنہ وقت اور پیسہ ضائع ہوگا۔ چنانچہ ایک طرف تو شہر کی دیواروں پر غوث بخش المعروف بگھیلے شاہ کا نام نظر آنے لگا اور دوسری طرف اُس کے بنگلے میں تمبو قناتیں اور دیگیں ٹھنٹھنانے لگیں۔

سب سے پہلے حکمران جماعت کے مقامی عہدیداروں کے اعزاز میں کھانا دیا گیا۔ پھر صوبائی سطح کی شخصیت کے اعزاز میں ضیافت اور پھر قومی سطح کے کسی رہنما کے استقبال کے لیے بگھیلے شاہ کی طرف سے پچاس بسیں فراہم کی گئیں۔ سب کچھ ایک تربیت یافتہ عملے کی زیرنگرانی ہونے لگا جن کا دفتر بنگلے میں قائم ہوگیا۔ بگھیلے شاہ کی جانب سے حکومت کی کسی تازہ پالیسی کی حمایت میں پہلے صفحے پر اخباروں میں بڑے بڑے اشتہار شائع ہونے لگے جن پر قائداعظم کی تصویر کے ساتھ حکمران جماعت کے سربراہ کی تصویر اور ذرا فاصلے پر بگھیلے شاہ کی تصویر چھپی ہوتی تھی۔ شہر میں جگہ جگہ کپڑے کے بینروں پر حکومت کے کارناموں پر مبارکبادی نعرے درج ہوتے تھے۔ نیچے منجانب غوث بخش المعروف بگھیلے شاہ لکھا تھا۔

اس دوران بگھیلے شاہ کا انتظامیہ میں کافی اثر رسوخ ہوگیا۔ کمشنر اور ڈی آئی جی سے لے کر مجسٹریٹ اور تھانیدار تک ہر جگہ اُس کا کارڈ چلنے لگا۔ بدلے میں کمشنر وغیرہ فلاحی کاموں کے لیے اُس سے چندے وصول کرنے لگے اور انتظامیہ کے بال بچوں کے لیے دس کاریں اُس نے مخصوص کر دی تھیں۔ اُس کی دو مربع زمین پر شاندار کالونی کھڑی ہو چکی تھی۔ کاغذی کام منٹوں میں ہونے لگے۔ اچانک بلدیاتی الیکشن ملتوی ہوگئے۔ اس کا فائدہ بگھیلے شاہ کو یوں ہوا کہ بے شمار امیدوار اپنی جمع پونجی

خرچ کر کے فارغ ہو گئے۔ ان میں دوبارہ مہم چلانے کی ہمت نہ رہی۔ اب جب الیکشن کی نئی تاریخ آئی تو حکومتی جماعت کی آشیرباد اُسے حاصل ہو گئی۔ کونسلر بن کر اُس نے میئر شپ کے لیے دیگیں اور دروازے کھٹکھٹائے۔ جس کی جتنی قیمت بنتی تھی ادا کی اور میئر بن گیا۔ کچھ حاسدوں نے اس پر اسمگلنگ، لینڈ مافیا اور کوآپریٹو کا پیسہ کھانے کے سنگین الزام بھی لگائے۔ میئر بننے کے بعد اُسے اکثر اپنا اجلاس چھوڑ کر صوبائی یا مرکزی وزیر کے استقبال کے لیے جانا پڑتا تھا۔ یہ بات اُسے کچھ اچھی نہ لگی اور اُس کا دل چاہنے لگا کہ جو نئے نئے چینل ملک میں آ رہے تھے، ان پر اس کی خبریں بلکہ بریکنگ نیوز چلیں اور سرکاری گاڑی کے آگے ہوٹر والے موٹر سائیکل دوڑیں۔

جب اُس نے صوبائی اسمبلی کے لیے ٹکٹ کی درخواست دی تو کچھ بہی خواہوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ جو مزا میئر شپ میں ہے وہ چھوٹی اسمبلی کی ممبری میں کہاں۔ لیکن بلھیلے شاہ کی نظر کسی اور شے پر تھی اور پھر جتنے پیسوں میں آدمی کونسلر بنتا ہے، اُس سے بہت کم پیسوں میں اسمبلی کا ممبر بن سکتا ہے۔ اگر پارٹی کا ٹکٹ اُس کے پاس ہو۔ البتہ ٹکٹ لینے کے لیے جو معاوضہ دینا ہوتا ہے اُس کا انتظام تھا۔ چنانچہ بلھیلے شاہ کو ٹکٹ مل گیا۔ اس لیے کہ وہ کھل کے پیسہ خرچ کر سکتا تھا۔ پانچ پانچ سو بسوں کا انتظام اُس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ بڑی آسانی سے وہ ممبر بن گیا۔

اگرچہ اخبار والوں نے حق نمک ادا نہ کرتے ہوئے اس کے خلاف دھاندلی کا الزام بھی لگایا۔ اُسے کابینہ میں اس لیے لے لیا گیا کہ شہر کے باقی چار ممبروں کی شہرت اُس سے اچھی نہیں تھی۔ ایک پر پولیس کے ٹاؤٹ ہونے کا الزام تھا۔ دوسرے پر شہر کی انتظامیہ کو نجی محفلوں میں لڑکیاں اور ولائتی شراب مہیا کرنے کا الزام تھا۔ تیسرے پر الزام تھا کہ اُس نے سرکاری زمین پر قبضہ کر رکھا ہے اور چوتھے پر یہ الزام

تھا کہ وہ انگوٹھا چھاپ ہے۔ پھر ٹھیلے شاہ کا سوز خوانی کا تجربہ آخر کب کام آتا تھا۔ وہ ایسا منجھا ہوا مقرر تھا کہ روتوں کو ہنسانا اور ہنستوں کو رُلانا اُس کا بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ اُس کے کابینہ میں شامل ہونے پر بعض کم ظرف حاسدوں نے یہ افواہ بھی اڑائی کہ اُس نے کسی بڑی شخصیت کو بھاری رقم یا دبئی میں بنگلہ خرید کے دیا ہے۔ تاہم اس طرح کے رکیک حملے ٹھیلے شاہ کے ارادوں کو کمزور نہ کر سکے۔ اب تو وہ تھوڑی تھوڑی انگریزی بھی بولنے لگا تھا اور اُس نے ایک ایئر ہوسٹس سے دوسری شادی بھی کر لی تھی۔ اب یہ اُس ایئر ہوسٹس کی خواہش تھی یا خود ٹھیلے شاہ کی اپنی سوچ کہ اُسے وفاقی دارالحکومت کی شامیں اپنی طرف کھینچنے لگیں۔ وہ اکثر وہاں کے فائیو سٹار ہوٹلوں میں رات گئے تک نظر آنے لگا۔ لیکن جلد ہی اُسے احساس ہو گیا کہ وفاقی دارالحکومت عرفیت والے لوگوں کو آسانی سے قبول نہیں کرتا۔

اُسے اپنا سارا سفر رائیگاں ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ احساس کمتری میں گھلنے لگا۔ اب اُسے ہر حال میں المعروف ٹھیلے شاہ کو غوث بخش سے الگ کرنا تھا۔ اس لیے کہ وفاقی دارالحکومت میں وہ پیر سید غوث بخش کے نام سے داخل ہو سکتا تھا۔ دوسری بیوی اور مشیروں نے مشورہ دیا کہ مخدوم سید غوث بخش بخاری سجادہ نشین پیر سید نجف شاہ کے نام سے خود کو مشہور کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس کام کے لیے بھاری رقم مہیا کی گئی اور اخباروں، جلسوں، کانفرنسوں، انٹرویوز اور سیمیناروں کے ذریعے اس نئے نام کو مشہور کرنے کی مہم کو وفاقی دارالحکومت کے ایک ماہر تقریبات کے حوالے کیا گیا۔ وہ نت نئے موضوعات پر جلسے کراتا اور خود ہی پریس ریلیز جاری کر کے اخباروں کے دفاتر میں پہنچ کے خبریں لگواتا۔ اس حوالے سے اُسے معلوم تھا خبر کیسے لگوائی جاتی ہے۔ اس چکر میں ٹھیلے شاہ کو کئی مشاعروں اور ادبی جلسوں کی صدارت بھی اپنے خرچے پر

کرنی پڑی جس میں اُس کی ادب دوستی کو بہت سراہا گیا۔ سجادہ نشینی کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے پیر سید نجف شاہ کی قبر پر عالی شان مقبرہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ قبر اُس جگہ پر تھی جہاں بزرگوں کی محفل لگا کرتی تھی اور چونی شاہ دوری رگڑا کرتا تھا۔ جب مقبرے کی تعمیر کے دوران بُھّیلے شاہ وہاں پہنچا تو اُسے چاروں طرف سے گالیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی نے پکارا بُھّیلے شاہ کہاں مر گئے ہو۔ دوری کو اچھی طرح پکڑو۔ مجھے کٹورا پکڑاؤ۔

پھر اُسے نجف شاہ کی شام غریباں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہی آہ و زاری اور ملا جلا شور اُس کے کانوں میں آیا تو اُس نے کان بند کر دیے۔ اگر چیف انجینئر اور ٹھیکیدار اس کے پاس نہ آتے تو پتہ نہیں وہ کب تک کھڑا رہتا۔ مقبرہ تعمیر ہوا جس پر خطیر رقم خرچ ہوئی۔ پورا عملہ رکھا گیا۔ لنگر جاری ہوا۔ شہر بھر کے ملنگ، فقیر، جواری، جیب تراش، نشئی جو طرح طرح کے نشوں کی سوغات لے کر آئے۔ منکے فروش، عطر فروش، گل فروش اور ایسے ہی بے شمار فروشیئے یہاں اُمڈ آئے۔ ہر وقت ایک میلہ سا لگا رہتا۔ دھمال، قوالی اور حال کی محفلیں جمنے لگیں۔ کہیں سے کوئی دوری ڈنڈا اور چٹائی لے کر آ گیا۔ بھنگ اور سردائی کے دور چلنے لگے۔ کہیں سے کان کا میل نکالنے والے، طوطا فال والے اور پہنچے ہوئے بابے بھی آباد ہو گئے۔ عرس لگنے لگے۔ غلاف بدلنے لگے۔ ایک آدھ بار کل پاکستان مشائخ کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ اِدھر تو یہ سلسلہ جاری ہوا اور اُدھر سید غوث بخش بخاری سجادہ نشین پیر نجف شاہ نے الیکشن جیت لیا۔ اب وہ بڑی اسمبلی میں پہنچ گیا لیکن اُسے اندر سے بہت ہی قلق تھا کہ بُھّیلے شاہ کو اُس نے اسمبلی میں آنے سے روک دیا تھا۔ اُسے لگا جیسے بُھّیلے شاہ کو اُس نے قتل کر دیا ہے۔

آخر اسمبلی میں پہلے سیشن کا دن آ گیا۔ اس نے پہلے اعلیٰ قسم کا خضاب لگایا۔

شیروانی پہنی۔ جناح کیپ سر پر رکھی اور اپنے سیکرٹری کو بلایا کہ آج کی مصروفیات کی تفصیل بتائے۔ سیکرٹری نے ایک کاغذ پڑھ کر سنایا۔ 1۔ بڑے بیٹے کو میڈیکل کالج میں خصوصی نشست پر داخل کرانا ہے۔ 2۔ چھوٹی بیٹی کے ایف ایس سی کے پرچوں کو تبدیل کرانا ہے۔ 3۔ مین بولیوارڈ میں پڑے ہوئے خالی سرکاری پلاٹ کو گونگے بہروں کے مرکز کے لیے الاٹ کرانا ہے۔ 5۔ ایک سرکاری کمپلیکس کی تعمیر کا ٹھیکہ لینا ہے۔ 6۔ شوگر مل کا لائسنس لینا ہے۔ اسی قماش کے کچھ اور کام بھی درج تھے۔ بگھیلے شاہ نے وہ کاغذ جیب میں رکھے۔ اسمبلی کی طرف روانہ ہوا۔ ہر منٹ بعد ایک پراڈو۔ ایک بی ایم ڈبلیو۔ ایک مرسڈیز۔ ایک آوڈی اور اسی طرح کی قیمتی سے قیمتی گاڑیاں اسمبلی کی سیڑھیوں پر رکنے لگیں۔ اُس کی مرسڈیز جو بالکل نئی سیریز میں آئی تھی۔ رکی اور وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کی جانب پہلا قدم لے کر باہر اترا۔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ اس لیے کہ اُسے بگھیلے شاہ کو یہاں سے اپنے آپ سے جدا کرنا تھا۔ خدا حافظ کہنا تھا۔ چند لمحے خاموش اور شرمندہ کھڑا رہا۔ پھر نیچی نگاہوں سے بگھیلے شاہ کو خدا حافظ کہا۔ اس طرح مخدوم سید غوث بخش سجادہ نشین پیر سید نجف شاہ رحمتہ اللہ علیہ اسمبلی کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بگھیلے شاہ وہیں کھڑا تھا۔ مخدوم غوث بخش اسمبلی میں داخل ہوا۔ اپنی نشست تک پہنچا اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے ساتھ والی نشست کو دیکھا تو حیرت سے اُس کی چیخ نکل گئی۔ وہاں بگھیلے شاہ بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی تو وہ اُسے باہر خود سے الگ کر کے آیا تھا۔ وہ یہاں کیسے آ گیا۔ پھر اُس نے اُس کے برابر کی نشست کو دیکھا۔ وہاں بھی ایک بگھیلے شاہ بیٹھا ہوا تھا وہ حیران ہوا کہ جسے وہ باہر چھوڑ آیا تھا وہ اتنے زیادہ چہروں میں کیسے تقسیم ہو گیا۔ اب جو اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو ہکا بکا رہ گیا۔ ہر نشست پر بگھیلے شاہ بیٹھا ہوا تھا۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا

ہے۔ وہ تو بگھیلے شاہ سے نجات حاصل کر آیا تھا مگر یہاں اتنے سارے بگھیلے شاہ کیسے آ گئے۔ اُسے اپنا آپ اجنبی لگنے لگا۔ پوری اسمبلی بگھیلے شاہوں سے بھری ہوئی تھی۔

مخدوم غوث بخش سجادہ نشین اکیلا ہو گیا تھا۔ ابھی وہ خفت مٹانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُسے ایسے لگا کسی نے اُس کا نام پکارا ہے، وہ بیٹھا رہا۔ پھر کسی نے آواز دی بگھیلے شاہ۔ اُسے لگا اسمبلی میں سب کا ایک ہی نام ہے۔ پھر اُس نے آنکھیں بند کیں تو اُسے لگا خیمے جل رہے ہیں۔ دھواں اُٹھ رہا ہے اور وہ شامِ غریباں سن رہا ہے۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ سب نشستیں خالی پڑی تھیں اور وہ اسمبلی میں اکیلا بیٹھا تھا۔ اُسے لگا جیسے وہ اپنی نشست پر نہیں بیٹھا۔ نجف شاہ کے سامنے دوزانو اُس کچی مٹی پر بیٹھا ہے جس پر ابھی ابھی اُس نے چھڑکاؤ کیا ہے۔

ایک اور ٹوبہ ٹیک سنگھ

عجیب لیلا ہے بھگوان۔

ادھر پاکستان سے واہگہ بارڈر سے آپ داخل ہوتے ہیں اور اٹاری میں داخل ہو جاتے ہیں۔ دونوں طرف کے وی آئی پی ایک جیسا پروٹوکول لے کر سینہ پھلائے داخل ہو جاتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے افسروں میں اندر خانے کچھ سمجھوتے ہیں۔ ان میں یہ بھی ہے۔ میں جب دو ملکوں کی سرحدوں کے بیچ ''نو مین لینڈ'' پر آ کر رُکا تو ادھر اُدھر دیکھا۔ پڑھا تھا کہ یہ خون کا دریا عبور کر کے ہم نے پاکستان بنایا تھا۔ اب وہاں خون کے دھبے بھی نہیں تھے۔ شاید اتنی برساتوں نے انہیں صاف کر دیا تھا۔ جب چند لمحے میں وہاں گزارا تو مجھے اچانک خیال آیا کہ اچھی خاصی کشادہ جگہ ہے۔ میں وہاں اپنا بستر لگاؤں اور رہنے لگوں۔ اس لیے کہ نہ میں پاکستان میں ہوں نہ ہندوستان میں۔ یہ تو ویسے بھی غیر جانبدار جگہ اور اللہ کی زمین ہے۔ جس پر کسی بھی ملک کا قانون نہ تو نافذ ہے نہ چل سکتا ہے۔ اتنی زمین تو ہے کہ میں کھیتی باڑی کر سکوں اور اپنا پیٹ پال سکوں۔ بارش تو ہوتی ہی ہے۔ یہاں میرا اپنا قانون ہوگا۔ میں حکمران بن کر رہوں گا۔ پرندے وغیرہ تو یہاں آتے ہی ہوں گے ان سے دوستی کر لوں گا۔

آزادی کے ساتھ کپاس اُگاؤں گا۔ اس سے سوت کات کر کپڑا بنالوں گا۔ پھر میں ایک پرچم بناؤں گا اور اپنے نوزائیدہ ملک کا اعلان کروں گا۔ ہوسکتا ہے میری رعایا بھی یہاں آباد ہو جائے۔ پھر باقاعدہ ایک اسمبلی بن جائے گی اور ایک ملک خدا کی زمین پر پاکستان کے بعد وجود میں آئے گا۔ جسے مملکت خداداد نمبر 2 کا نام دیا جا سکے گا۔ اچانک مجھے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" یاد آیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کہیں میں وہ تو نہیں ہوں۔ شاید ٹوبہ ٹیک سنگھ نے مجھ میں دوسرا جنم لیا ہو اور یہ اُس کا خواب ہو۔ اچانک مجھے ہندوستان کی طرف کے سکیورٹی افسر نے گھور کے دیکھا اور میرے پاس آیا۔ میں نے کہا "تم سعادت حسن منٹو کو جانتے ہو؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے بتایا کہ وہ افسانہ نگار تھا۔ "اچھا تو پھر۔"

پھر کچھ بھی نہیں۔ اُس کا ایک کردار تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ یا شاید وہ خود ہی تھا۔ وہ اسی جگہ جہاں میں کھڑا ہوں جم کر کھڑا ہو گیا تھا اور گر کے مر گیا تھا۔

"کب کی بات ہے۔"

"یہ نہیں معلوم۔ کیونکہ اس واقعے کا کسی پولیس اسٹیشن میں اندراج نہیں ہے۔"

"تو پھر صاحب اتنا غور کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ آپ کا کچھ لگتا تھا۔"

"ہاں وہ ہم سب کا کچھ نہ کچھ لگتا تھا۔"

"تو آپ آگے بڑھو ہماری نوکری کیوں خطرے میں ڈالتے ہو۔"

سردار ہرنیک سنگھ گھڑ وآں مجھے لینے آیا ہوا تھا۔ مجھے گورونانک یونیورسٹی میں لیکچر دینا تھا اور کچھ دوستوں سے ملنا تھا اور ایک امانت ٹوبہ ٹیک سنگھ کی بیٹی کو پہنچانی تھی۔ اس کا جو بھی نام ہوگا بتادوں گا کیونکہ پاکستان کے سرکاری کھاتوں میں اُس کے

کئی نام ہیں۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ ڈوبہ نیک سنگھ ایک نہیں ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ میرے پاس بہت بڑی امانت تھی اور اناری سے نکلتے ہی گاڑی پانچ سے سات منٹ میں ایک خوبصورت کالونی میں داخل ہوگئی۔ ہرنیک سنگھ نے کہا" آؤ جی گھر آ گیا ہے۔" میں حیران کہ میں اپنے گھر ڈیفنس سے نکلا اور بیس منٹ میں ہرنیک سنگھ کے گھر پہنچ گیا۔ اتنا وقت تو ڈیفنس کے اندر ایک بلاک سے دوسرے بلاک میں لگتا ہے۔ میں ناشتہ کرتے ہوئے حیران تھا کہ اگر یورپ کی طرح یہاں بھی سرحدیں بس نام کی ہوں اور دونوں طرف کی گاڑیاں شناخت کے بعد آ جا سکتی ہوں تو میں دن میں دو چکر ہرنیک سنگھ کے گھر لگا سکتا ہوں۔ مگر دونوں طرف جذبات کی صنعت نے بہت ترقی کر لی تھی اور نفرت کی منڈیاں نقد ادائگی پر دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی تھیں۔ اچانک کوئی باہر آیا تو ہرنیک سنگھ نے بتایا۔ باہر دارو سنگھ آیا ہے" دارو سنگھ مطلب اس کا اصلی نام ہے۔"

"نہیں پتہ نہیں اصلی نام کیا ہے۔ سب اسے دارو سنگھ کہتے ہیں۔"

"مجھ سے ملنے کیوں آیا ہے۔"

"کیونکہ تم ہی آج اُس کہانی کو ختم کر سکتے ہو۔ نہیں تو وہ چلتی رہے گی۔"

"کہانی کیا ہے؟"

"وہ بتا دے گا۔"

"ایک دارو سنگھ بھلا کس کو اپنی کہانی بتائے گا۔ وہ کہانی میں کئی بار گرے گا۔ کئی بار بھولے گا۔ کئی بار لڑکھڑائے گا۔"

یہی بس اُس کی کہانی ہے جو ہم سنتے آرہے ہیں۔"

"دارو سنگھ دارو پیتا ہے۔"

''نہیں دار وا سے چق ہے۔''

اب تو انتظار حسین کی طرح میرا ماتھا ٹھنکا۔ ویسے میرا ماتھا ذرا تنگ سا ہے۔ جب ٹھنکتا ہے تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ پھر بھی میں نے کہا اُسے لے آؤ۔

دارو سنگھ کے بال اوپر سے نیچے تک دیوندر ستیارتھی کی طرح بے ہنگم بڑھے ہوئے تھے۔ اب اگر کوئی دیوندر ستیارتھی کو نہیں جانتا تو وہ افسانہ نہ پڑھے۔ کہ دیوندر ستیارتھی لاہور میں بہت گھوما پھرا۔ ٹی ہاؤس سے لے کر اردو بازار تک اُس کے قصے بہت مشہور ہیں۔ میرے دوست اے حمید نے تو اُس کی داڑھی اور کیس کو منڈواتے بھی دیکھا ہے اور اس پر لکھا ہے کہ ایک دن میں اُردو بازار سے گزرا تو دیکھا دیوندر ستیارتھی پبلشر کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ میں گیا تو پاپے کے ساتھ چائے کی چسکی لیتے ہوئے پبلشر نے کہا! اسے پہچانتے ہو۔ میں چائے کے ساتھ ایسا سلوک بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کہ میں سیلون اور برما اور ساؤتھ انڈیا کی چائے کے ذائقوں کو اپنے اندر لیے پھرتا ہوں۔ میں نے بددلی سے پبلشر سے کہا۔ ''کون ہے؟''

پبلشر نے بتایا ''یہ دیوندر ستیارتھی ہے۔''

''اچھا تو وہ صرف داڑھی مونچھ تھا۔ اندر سے بغیر کھال کے بچھڑا نکل آیا ہے۔''

خیر تو دارو سنگھ سامنے آیا۔ میں پریشان کہ یہ امرتسر میں میرا کوئی مداح ہے یا کوئی مخبر ہے یا اللہ کیا ماجرا ہے۔ دارو سنگھ سر سے پاؤں تک داڑھی اور بالوں میں رچا بسا ہوا تھا جس وجہ سے اُسے دیوندر ستیارتھی سے تشبیہ دی گئی تھی۔ میں نے میزبان سے پوچھا اسے مجھ سے کیا کام ہے۔ تو اُس نے ایک کہانی شروع کر دی۔ میں نے کہا قصہ در قصہ آج کے زمانے میں رائج نہیں ہے کہ وقت کسی کے پاس نہیں ہے۔ دارو سنگھ خود

بولا۔

''آپاں داناں دارا سنگھ سی۔ ٹھیک۔ فیر آپاں نوں اپنی سٹوری دا سٹارٹ ملیا۔ مطلب آپاں دی وی تے سٹوری ہو سکدی اے کہ نہیں۔''

''بالکل ہو سکدی اے۔''

''ہاں۔ تے سٹوری سٹارٹ ہوندی ہے 1947ء وچ ہندوستان دی ونڈ پے گئی۔ میرے ماں تے باپو ملتان وچ محلہ بھی شیر خان وچ رہندے ہان۔ باپو داناں سی ہرنام سنگھ۔ ماتا داناں پریت کور سی۔ او محلہ ہندوواں دا سی۔ سکھ تاں نواں نواں کم کارلئی اوتھے آبادی۔''

میں نے اُسے ٹوکا۔ ''ٹھہرو، ٹھہرو۔ تمہیں کس نے بتایا کہ میرا جنم محلہ بھی شیر خان ملتان میں ہوا تھا تو جی تے فیر جتھے سنو۔ لوک اینویں ای سانوں دارو سنگھ بولدے نیں۔ میں تاں ساد ھو سنت آں۔ کیویں مینوں سجان ہوئی۔ اک واری فیر جتھے سنو۔''

''خیر آپ بات پوری کریں۔''

''تو جی میں اڑ گیا۔ جتھے جاڑاں سی۔ میرے باپو نوں مسلمان کڑی نال عشق ہو گیا۔ جدوں میں ماں دے پیٹ اچ پیا۔ باپو نے کیس صاف کرائے۔ موسلہ بن کے اُوس کڑی نال نکاح پڑھا بیٹھا۔''

دارو سنگھ تیری پیدائش باڈروں اس پار پاکستان بنن توں بعد ہوئی۔''

''ناں ناں مہاراج۔ آپاں دی پیدائش پاکستان بنن توں بعد نہیں ہوئی۔ ہندوستان دے بٹوارے توں بعد ہوئی۔''

''اکو گل نہیں سردار جی'' میں نے کہا۔

''ساڈے لئی ہندوستان دی ونڈ تے بٹوارہ اصل واقعہ اے۔ جتھے سنو۔''

''اچھا خیر اصل بات بتاؤ۔ پھر کیا ہوا۔ باپو ملا یا نہیں۔''

''باپونوں میں نہیں ویکھیا۔ میں ایس عمر نوں اپڑ گیا۔''

''سردار جی تسی پاکستان دی عمر برابر ہو گئے ہو۔''

''ناں تاں مہاراج پاکستان میری عمر برابر ہے۔ میں نہیں۔''

''چلو ایسے ہی سہی۔ پھر میں کیا کر سکتا ہوں تمہارے لیے۔''

ہر نیک سنگھ گھڑ ووال نے بتایا کہ جب اسے پتہ چلا کہ اس کے باپ نے مذہب اور اس کی ماں کو چھوڑا تو اس کا دماغ گھوم گیا۔ سکھ کا دماغ گھومنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا دن کے بارہ بجے یہ پاکستان کی طرف منہ کر کے باپ کو گالیاں دیتا ہے اور پھر رات کو دارو پی کر سرحد پہ آجاتا ہے۔ جونہی رات کے بارہ بجتے ہیں یہ خالی بوتل سرحد کی طرف پھینکتا ہے اور باپ کی ایسی تیسی پھیر دیتا ہے۔ پاکستان سے آنے والے فنکاروں اور ادیبوں سے پوچھتا ہے کہ اس کا باپو کون ہے آج اس نے تمہیں گھیر لیا ہے۔''

''او گل وی تاں دسو۔ آپاں آ پڑیں گنڈی اناری دے باڈر توں گنڈار کے پاکستان دے باڈر دے پھاٹک نوں جا ماری۔ تے آپاں نن پھڑے گئے۔''

''ہاں ہاں یہ واقعہ تو ابھی ہوا ہے۔ سارے میڈیا پر آیا تھا۔ تو وہ دارو سنگھ تم تھے۔''

''تے ہور کون ہو سکدا اے۔ او تاں واہگورو دی مہر ہوگئی جو باڈر سکیورٹی آلے مینوں چنگی طرحاں جاندے سی۔ آپاں فیمس جو ہو گئے آں۔''

''فیمس ہون کارن نئی چھڈیا۔ تن مناری ایدر بڑا گند پاندے نیں تے بھارت سرکار نوں اے گند صاف کرنا پیندا اے۔'' ہر نیک سنگھ نے بات کو مختصر کر دیا۔

''تاں سردار جی پورا بھارت گند پاندا اے۔ پورے پنجاب دے سردار رل ملا کے گند وچ آپڑاں حصہ پاندے نیں۔ او تاں یاد نئیں رہندا تہانوں۔ سوہری دے او۔ اک دارو سنگھ پرابلم ہو گیا اے۔'' دارو سنگھ نے ٹوکا۔

''اوے حالے بارہ نئیں وجے۔ سناپ اگا۔''

''نہیں تو اب دارو سنگھ تم چاہتے کیا ہو۔ میں پاکستان سے آیا ہوں اور میرا جنم اُسی محلے میں ہوا ہے جہاں تمہارا باپ رہتا تھا۔ تمہاری ماتا کے ساتھ۔''

''ماتا دی ڈ۔تھ ہوئی تاں میں سوں چکی۔ جو باپو نوں معاف نئیں کراں گا۔ مرڈر کراں گا۔ میں باپو دا مرڈر ڈیلی کرناں۔ ڈیلی رات دے باراں وجے میں باپو دا مرڈر کرناں۔ کدی کرپان نال۔ کدی آپڑیں گڈی ہیٹھ اونوں ہٹ کر کے۔ کدی اودی دھون نوں ہتھاں وچ دبا کے۔ کدی فائر مار کے۔ کدی تے میں اودا مرڈر دنداں نال چپ کے کرناں۔ تسی اے کہانی ختم کرسکدے او۔ وسو میرا باپو جیوندا اے۔ کتھے اے۔''

میں نے ماحول دیکھا۔ ساری بات میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ دارو سنگھ کا مسئلہ بھی بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ کشمیر کے مسئلے کی طرح کہ تقسیم کے بعد جو مسئلے اب تک التوا کا شکار چلے آتے تھے جن میں دریاؤں کا مسئلہ، کشمیر کا مسئلہ، سرکریک اور سیاچن کا مسئلہ اور بھی جو کچھ ایجنڈا میں ہوتا ہے۔ اب ان سب میں دارو سنگھ کا مسئلہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ کم سے کم میری ذمہ داری اب بن گئی تھی کہ میں اگر کم سے کم ان مسئلوں میں سے ایک مسئلہ حل کرسکتا ہوں تو کروں۔ اور میں یہ مسئلہ حل کرسکتا تھا۔ فلیش بیک میں کہانی گئی تو میں نے دیکھا کہ میں نانا کے گھر میں محلہ نبی شیر خان میں ہوں۔ گھر میں ایک کردار کا نام شام سے ذرا پہلے گونجتا تھا۔ ''ناماں'' مجھے اس کردار

سے بے حد دلچسپی ہوتی تھی کیونکہ وہ شام ہوتے ہی نانا کے گھر کے عین سامنے ایک گھر کے چبوترے پر نمودار ہوتا تھا۔ سارا دن اُسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شام کے وقت وہ اس چبوترے پر اپنا جستی دیگچا لگاتا تھا۔ جس میں مسور کی دال ہوتی تھی۔ وہ سفید تہمد، سفید قمیص اور سفید پگڑی باندھتا تھا جو سکھوں کی پگڑی کی طرح ہوتی تھی لیکن ذرا ڈھیلی ہوتی تھی۔ اس کی مونچھیں بڑی تھیں۔ یوں سمجھیں کہ ایک سکھ کے مسلمان ہونے کے بعد کا حلیہ یہی ہوسکتا ہے۔ ناماں ہمارے محلے کا مقبول کردار تھا کہ شام ہوتے ہی گھر سے کٹورے کٹوریاں لے کر بچے بڑے نکل آتے تھے اور وہ اپنے بڑے چمچے سے سب کی کٹوریاں اور کٹورے بھرتا جاتا تھا۔ اُس دال کی لذت اور خوشبو سے پورا محلہ مہکتا تھا۔ ہر رات گھروں میں کھانا نہیں بنتا تھا۔ ناماں ہر گھر میں کھانا پہنچاتا تھا۔ ایک گھنٹے میں وہ فارغ ہوجاتا تھا اور پھر غایب بھی ہوجاتا تھا۔ کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ دن کے بائیس گھنٹے کہاں ہوتا ہے۔

میں نے اپنی نانی سے پوچھا یہ ناماں کون ہے۔ تو نانی نے کہانی سنائی۔ کہ یہ ناماں نہیں یہ ہرنام سنگھ ہے۔ ادھر اس کا خاندان تھا۔ اسے چغتائیوں کی لڑکی سے عشق ہوگیا جو سامنے والے چوبارے پر رہتی تھی۔ اب میں اتنا تو بیوقوف نہیں تھا کہ چغتائی خاندان کو نہ جانتا۔ اس خاندان کے تین نقش تو بالی وڈ کو شکست دے سکتے تھے۔ تو پھر نانی اماں کیا ہوا؟ بلکہ نانی نے مجھے اُس شہزادی کی کہانی سنائی تھی جو رات کو نیند میں سوئی ہوئی تھی جس پر دیو عاشق ہوگیا تھا۔ میں نے ایسے ہی سوال کردیا کہ نانی اماں وہ شہزادی کسی کمرے میں نہیں سوتی تھی۔ نانی اماں نے ناراض ہوکر کہا کہ شہزادی بھلے کہیں بھی سوے دیو نے عاشق ہونا ہی ہوتا تھا۔ تو ایسا ہی کچھ محلہ میں شیر خان میں ہوا تھا کہ ہرنام سنگھ عاشق ہوگیا۔ نیند میں سوئی چغتائی خاندان کی لڑکی پر۔ مگر کیسے وہاں

پہنچا یہ محض اتفاق تھا۔ خیر فضول طرح کی جزئیات کو چھوڑ تے ہیں۔ بس پھر کیا ہونا تھا۔ اِدھر ہرنام سنگھ بھی قد کا اونچا، ناک نقش کا سردار تھا۔ لڑکی بھی قیدی شہزادی تھی۔ عشق کا جواب عشق سے دے دیا۔ مگر لڑکی سیانی تھی۔ شرط رکھ دی۔ کیس منڈوا کے اسلام قبول کرلو۔ ہرنام سنگھ نے جب چغتائیوں کی لڑکی کو رسان کے ساتھ بات کرتے دیکھا اور ڈیوڑھی کے اندھیرے میں جوان بدن کو بازوؤں میں بھر کے دیکھ لیا کہ اس قیامت کے ساتھ قیامت کے روز اٹھائے جانے میں کوئی ہرج نہیں ہے تو علاقے کی مسجد میں پہنچ گیا۔ مولوی محمد رمضان نے دیکھا پاکستان بننے والا ہے اور پاکستان کی برکت سے اگر ایک سکھ اُس کے ہاتھ پر مسلمان بننے والا ہے تو یہ نظریۂ پاکستان کے لیے مضبوط بنیاد قائم ہو سکتی ہے۔ اُس نے تاریخ میں نام پایا اور ہرنام سنگھ ناماں بن گیا۔

''تسی میرے باپوؤں ویکھیا اے۔ اونے تے کدی دال نئیں سی پکائی۔ ماتا کہندی سی او تے سوتر منڈی دکان کردے سی۔''

''داروسنگھ۔ میں تے بس نکے ہندیاں اونوں ویکھیا۔ فیر تے میں نانے دے گھر توں شفٹ ہو گیا۔''

''تے کہانی کیویں کے گی۔''

''ہاں تو غور سے سنو۔ جب تمہارے باپو نے اپنا دھرم چھوڑا تو پاکستان بننے والا تھا۔ پھر کیا ہوا کہ اُس نے چغتائیوں کی لڑکی کو بلوے میں گھر سے نکالا اور نکاح کے لیے لے گیا کسی مسجد میں۔ اُس مسجد پر ہندوؤں کا حملہ ہو گیا۔ مشکل سے ہرنام سنگھ نے محبوبہ کی جان بچائی۔ مگر پھر کیا ہوا؟''

''او جی بولوتاں کاہدے لئی سسپنس ماررے او۔''

''پھر وہ لے کر نکلا محبوبہ کو مگر چغتائیوں کا خاندانی خون اپنا کام کر چکا تھا۔ وہ

کلہاڑیوں گنڈاسوں سے نہیں انگریزی پستولوں اور بندوقوں سے اپنی لڑکی بچانے کے لیے نکلے اور انہوں نے ہرنام سنگھ کو آ لیا۔"

چونکہ ہرنام سنگھ نے مسلمان ہو کر نکاح کر لیا تھا۔ اس لیے چغتائیوں نے ہرنام سنگھ کو قتل نہ کیا۔ اُسے اس شرط پر بخش دیا کہ وہ طلاق نامے پر دستخط کر دے۔ ہرنام سنگھ نے محبوبہ کو دیکھا جس نے آنکھیں نیچی کر لی تھیں۔ ہرنام سنگھ سمجھ گیا اور طلاق نامے پر دستخط کر دیے اور اُس کے بعد معلوم نہیں وہ لڑکی اور اُس کا خاندان کہاں گیا۔ ہرنام سنگھ اب مسلمان ہو چکا تھا۔ وہ پیچھے نہیں جا سکتا تھا اُسے ایک مسلمان خاندان نے پناہ دے دی۔ اس نے شادی نہیں کی۔ بس دال کا دیگچہ لے کر آ جاتا اور پھر غائب ہو جاتا۔

دارو سنگھ نے کہانی سنی۔ اُس کی کہانی مکمل ہو چکی تھی۔

"باپو نوں روز قتل ہون دا شوق سی۔ آپاں نوں سُنے اج آ کے دس جاندا۔ میں نہیں رہیا۔ تاں آپاں روز رات نوں مرڈر دا شو نہ کرو ے۔ چلو جی ناٹک دا اینڈ ہو گیا۔ آپاں ہن کوئی ہور منڈوا جا کے لانے آں۔ واہ باپو دغا دے گیوں۔ بے وفائی کر گئی۔ چنگائی کیتا اے ناٹک رات نوں روز آپاں نوں انرجی دے رہیا سی۔ ٹٹ گئی تڑک کر کے۔ او باؤ جا۔ ساڈے تے ساہ ہی مک گئے نیں۔ ہن جیون دا سواد نئیں آناں۔ چل دارو سنگھا او تھے چلیے جتھے باپو نہ باپو دی ذات ہووے۔"

دارو سنگھ سر جھکا کے نکل گیا۔ اگلے دن میں نے گورو نانک یونیورسٹی میں لیکچر دیا۔ سوال جواب ہوئے زیادہ سوال بٹوارے پر ہوئے اور اُس وحشت و بربریت پر ہوئے جو سعادت حسن منٹو نے افسانوں میں ظاہر کی تھی۔ میں نے کہا کہ اپنے بزرگوں سے کیوں نہیں پوچھا کہ ایک اور جلیانوالہ اس سیراب زمین پر کیوں ہونے دیا۔ کیا

ایک خون دھرتی کی پیاس بجھانے کے لیے کافی نہیں تھا۔ اس پر وہ تو نہیں بولے ایک خوبصورت بیرسٹر سکھی سنگھ ایڈووکیٹ سامنے آیا۔ ہائیکورٹ میں پریکٹس کرتا بڑا نام تھا اُس کا پنجاب اور دہلی میں۔ سکھی سنگھ نے مجھ سے وقت مانگا کہ میری دعوت کرنے کے ساتھ ایک بہت ضروری معاملہ نمٹانا چاہتا ہے۔ جو صرف میں نمٹا سکتا ہوں۔ میرا ماتھا پھر انتظار حسین کی طرح ٹھنکا کہ ابھی دارو سنگھ کو فارغ کیا ہے اب سکھی سنگھ آ گیا ہے۔ میں نے دعوت قبول کر لی۔ سکھی سنگھ بہت دولت مند بیرسٹر ہے لیکن پہلے ایک بات جو میں بھول نہ جاؤں وہ بتانا ضروری ہے۔ میں نے یونیورسٹی میں سوال جواب کے سیشن میں بتایا کہ آپ پنجاب والوں کو پتہ ہی نہیں ہے کہ آپ نے بٹوارے میں اپنا کیا کیا جوہر پاکستان کے حوالے کر دیا ہے۔ جب میں نے بتایا کہ صرف پنجاب نے کیا خزانہ ہماری جھولی میں ڈالا ہے تو انہیں کچھ پتہ نہیں تھا۔ میں نے بتایا کہ ہم جو ہیرے یہاں سے لے گئے وہ خواجہ خورشید انور، سیف الدین سیف، اے حمید، اشفاق احمد، ناصر کاظمی، حفیظ ہوشیار پوری، شہزاد احمد، مظفر علی سید، سعادت حسن منٹو، باری علیگ، حفیظ جالندھری، اعجاز بٹالوی، استاد امانت علی، فتح علی خان فیملی، طفیل نیازی، روشن آرا بیگم، اے حمید (موسیقار) ظہیر کاشمیری، استاد سلامت علی خان فیملی اور بھی نام تھے۔ سننے والے مجھے دیکھتے رہے جیسے میں نے ان پر کوئی سانپ چھوڑ دیا ہے۔ اس پر ان میں سے ایک اٹھا اور اُس نے جواب دیا کہ جو خزانہ ہم بٹوارے میں اُدھر سے لائے ہیں وہ بھی بہت قیمتی ہے۔ انہوں نے جب بتایا کہ دلیپ کمار، راج کپور، کامنی کوشل، بلراج ساہنی، بی آر چوپڑا، خوشونت سنگھ، دیو آنند، دھرمیندر، راجیش کھنہ، گوپی چند نارنگ اور ...... میں نے روک دیا کہ اس طرح تو دونوں طرف کے شجرہ نسب مکمل جائیں گے۔ اور پاکستان اور انڈیا کے ریسرچ سکالر کے لیے ایک نیا میدان

مکمل جائے گا۔ ایک نے سوال کر دیا کہ قرۃ العین حیدر بڑے غلام علی خان اور عبدالحی ساحر لدھیانوی پاکستان چھوڑ کر کیوں آئے تو میں نے کہا یہ نام ناکافی ہیں اور بھی لوگ تھے جو چھوڑ آئے تھے اور اگر موقع ہوتا تو بے شمار اور بھی شامل سفر ہو جاتے۔

سکھی سنگھ مجھے اپنی دعوت میں لے گیا۔ جہاں باربی کیو میں فش تکہ، چکن تکہ، کباب اور اس طرح کے بے شمار کھانے موجود تھے۔ وہاں بڑے بڑے جج، وکلاء، مقامی آرٹسٹ، شاعر، دانشور اور صحافی نما انٹرویو لینے والے موجود تھے۔ کچھ تو کیمرے بھی لائے تھے۔ میں نے سکھی سنگھ سے معذرت کر لی کہ میں لوکل میڈیا ٹریڈ کو جانتا ہوں۔ کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنے۔ دعوت کے بعد سکھی سنگھ مجھے اپنی کوٹھی کے پچھواڑے ایک کمرے کی طرف لے گیا کہ اُس کا دادا سو سال کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ چارپائی پر گٹھڑی بنا ہوا پڑا تھا۔ سکھی سنگھ نے بتی جلائی تو اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ سکھی سنگھ اس کے قریب گیا اور کہا ''دادو پاکستانوں پروہنے آئے نیں۔'' وہ بجلی کی طرح اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا'' اِک گل کہن نوں میں ساہ روکے ہوئے نیں۔ میرے پنڈ توں ہوارے دے سمے سارے مسلمان پریوار میں آپ ٹریناں تے بٹھائے سی۔ کسے جی نوں کوئی پھٹ نہیں لگیا سی۔ بعد اچ ٹرین تال کی بیتی۔ ایدی جہاں واری میری نہیں سی۔'' مجھے منٹو کا افسانہ'' گورمکھ سنگھ کی وصیت'' یاد آ گیا۔ مگر میں چپ رہا۔ اُس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے پھر کہا۔

'' میں ایسی لئی جیوندا ہاں جو کسے پاکستانی نوں اے دس سکاں جو میرے پنڈ اچ کسے مسلمان دا قتل نہیں سی ہویا۔ اک کڑی ڈر دے مارے اُپلیاں دی کوٹھی وچ لک گئی سی۔ کئی دن اوسے توں نکی رئی۔ جدوں امن ہویا تاں اودا گھر ملیا۔ پنڈ دے لوکاں اودی مرضی لئی۔ اونے بولیا اوا ایتھے رے گی۔ کسے نے اونوں دھرم چھڈن دی

گل نہ کیتی۔ مگروں اے ہویا جواونوں سردار امریک سنگھ دے گھبرو پتر ہرمیت سنگھ نال پیار ہوگیا تے اودا ویاہ اودے نال ہوگیا۔ اونے دھرم ئیں بدلیا سی۔ پنج وقتی نماز پڑھدی سی۔ چارجی اونے جے۔ بڈکا ٹھ دی پکی سی۔ ورہے پہلاں اوہدا سورگ اونوں مل گیا۔ تسی چاہوتاں اوہدی کڑیاں نال مل سکدے او۔ منڈے تاں ٹوراٹو اپڑ گئے نیں۔''

میں خاموش رہا اور سکھی سنگھ کو اشارہ کیا کہ چلیں۔ اُس نے دادے سے کہا۔

''داوداے پاکستانی سب کچھ سمجھ گیا اے۔ ہن جاوے۔''

''ہاں اک گل پچھنی باقی اے۔ اینوں پچھ اپنے میرا اعتبار کیتا اے یا نئیں۔''

''میں نے سب اعتبار کرلیا ہے۔ داداجی۔ آپ نے جو کہا دل میں بھرلیا ہے۔''

''چنگا فیر رب راکھا۔ ہن میں آخری ساہ لے سکناں۔''

اور اُس نے آخری سانس لی اور وہ جو گٹھڑی بنا ہوا پڑا تھا۔ بس گٹھڑی ہی میں ٹھنڈا ہوگیا اور اگلے دن مجھے اُس کے انتم سنسکار میں جانا پڑا۔ سکھی سنگھ شانت ہو چکا تھا۔ اُس کا کئی سالوں کا بوجھ میں نے ہلکا کردیا تھا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے اُسے کہا اب میرے دل کا بوجھ ہلکا کردو۔ میں نے ایک امانت ایک عورت کو سونپنی ہے۔ سکھی سنگھ پیشے کا وکیل بلکہ بیرسٹراب اُس کا ماتھا ٹھنکا ''جو حکم مہاراج۔''

''ساری تاریخ صرف آپ کے ہاں بسرام نہیں کرتی۔ کچھ تاریخ ہمارے ہاں بھی پناہ لے سکتی ہے۔''

وہ ساکت ہوکر متوجہ ہوا۔ میں نے کہا'' میں کوئی بات نہیں کروں گا۔ مجھے

اس پتے پر لے جائیں جہاں ایک خاتون رہتی ہے اُسے اُس کی امانت دینی ہے۔ سکھی سنگھ نفیس انسان ہے۔ وہ نہیں بولا مگر بولا تو اتنا بولا کہ شاہ جی جو پتہ آپ نے دیا ہے۔ اس جگہ کا ویزا آپ کے پاس نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ وہ ہے تو اسی پنجاب میں۔ اس نے کہا ہے تو مگر پنجاب بھی اب یہاں دو اور ٹکڑوں میں بٹ چکا ہے۔ ہریانہ کا صوبہ بن چکا ہے اور چندی گڑھ بھی پنجاب سے الگ تین صوبوں کا مرکز بن گیا ہے۔ میں نے سکھی سنگھ سے کہا کہ یہ آپ لوگوں نے اچھا کیا ہے۔ کاش ہمارے پنجاب کے نیتا بھی اپنے پنجاب کے تین حصے کرلیں۔ مثال تو آپ نے قائم کردی ہے۔ میں نے سکھی سنگھ سے کہا تم کس قسم کے پیرمنر ہو جو مجھے ویزے کا خوف بتا رہے ہو۔ تم آؤ پاکستان میں اعتزاز احسن تو دور کی بات ہے میں ہی تمہیں بغیر ویزے پورا پاکستان گھما سکتا ہوں۔ اگر اعتبار نہ ہو تو 1985ء میں کشور ناہید اور میں شمیم حنفی کی بیگم اور دو بیٹیوں کو بغیر ویزے لاہور سے اسلام آباد۔ پھر ایبٹ آباد، پھر ناران کاغان اور پھر نتھیا گلی مری سے ہوتے ہوئے لاہور واپس لائے تھے۔ کہو اب کیا کہتے ہو۔''

سکھی سنگھ اپنا یار ہے۔ اُس کی دُم پر پاؤں آ گیا تھا۔ اُس نے گاڑی نکالی اور مجھے اُس گاؤں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ میں نے کہا سکھی سنگھ تم نے پوچھا نہیں مجھے کسے کیا امانت دینی ہے۔ سکھی نے کہا شاہ جی آپاں سردار ہیں۔ آپاں واسطہ پھر جائے تاں آپاں دے باراں وج جاندے نیں۔''

میں نے اب کہانی شروع کی۔ لاہور میں ایک دن مجھے ٹیلیویژن کے ایک ذمہ دار افسر نے اپنے پاس بلایا اور ایک ڈراما لکھنے کا اچھا معاوضہ پیش کیا۔ میں نے کہا۔ ڈراما کیا لکھنا ہے۔ اس نے کہا شام کو ایک جگہ جانا ہے۔ ہم وہاں پہنچے۔ ایک سردار جی ملی جلی داڑھی میں مطلب بیچ میں سیاہ آس پاس سفید اور بہت ہی لمبی تھی وہ

داڑھی۔ سر پر سرداروں کی پگڑی۔ پورا لباس سردار جی کے شایانِ شان۔ ہم وہاں پہنچے۔ یہ لاہور کی نسبتاً نئی آبادی تھی۔ مگر ایسی بھی اجنبی یا دور نہیں تھی۔ ہم وہاں بیٹھے تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ سردار جی کے تین سے زیادہ نام تھے۔ یہ مجھے وہاں پتہ چلا۔ ہم اس وقت ان کا نام جو پاکستان کے حساس اداروں نے اُسے دیا تھا۔ وہ تھا گربچن سنگھ۔ بے حد خوبصورت اور سات فٹ کا سردار مجھے اندر لے گیا۔ کچن میں اُس نے میرے لیے مٹن کڑاہی بنائی تھی جو پک رہی تھی۔ لگتا تھا اُس کا کوئی ڈھابہ ضرور ہو گا۔ خیر ہم کہانی میں واپس آتے ہیں۔ یہ اندرا گاندھی کی ایمرجنسی کے بعد کا زمانہ ہے۔ گربچن سنگھ گولڈن ٹیمپل کی بے حرمتی سے اتنا باغی ہوا کہ اُس نے تین چار پولیس والوں کو قتل کر دیا اور پھر اُس کے گھر پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ یوں سمجھ لیں کہ ہمارے گلزار صاحب نے اپنی فلم ''ماچس'' میں وہ سب کہانی کہہ دی مگر یہ اور کہانی تھی۔ گربچن سنگھ کے تین نام پاکستان کے حساس اداروں نے رکھ دیئے۔ میرے لیے یہ مشکل ہو گیا کہ میں اُسے کس نام سے پکاروں۔ بہر حال میں اُس سے ملتا رہا۔ وہ ڈراما بنا کر کینیڈا بھیجنا چاہتا تھا تاکہ کینیڈا رہنے والے سکھ خاندانوں پر اندرا گاندھی کی ایمرجنسی اور گولڈن ٹیمپل پر حملے کے ظلم سے ان کے اندر خالصتان کی تحریک کے لیے جذبہ پیدا ہو اور وہ ہندوستان سے قطع تعلق کر کے اس مقصد کے لیے جدوجہد کریں۔ میں نے نہ تو انکار کیا نہ اقرار کہ میں اس طرح کا کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا ڈراما انسانیت کی تعلیم کے لیے ہوتا ہے۔ نفرت پھیلانے کے لیے نہیں ہوتا لیکن گربچن سنگھ کا مسئلہ میں سمجھ گیا تھا اور میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ گوربچن سنگھ اب کلاس اول کا قیدی ہے۔ نہ وہ پاکستان سے باہر جا سکتا ہے نہ وہ یہاں آنے والے سکھ یاتریوں سے مل سکتا ہے۔ اب وہ ایک ایسا راز تھا جسے سینے میں دبا کر ہی رکھا جا سکتا ہے اور وہ پاکستان کے سینے

میں موجود تھا۔

میں اتنا مصروف رہتا ہوں کہ میرے پاس اس طرح کے کاموں کے لیے وقت کہاں سے ہوگا۔ لیکن کرپچن سنگھ یا گورمیت سنگھ یا کوئی بھی سنگھ میرے لیے ایک سوال تھا کیونکہ وہ ایک انسان بھی تو تھا۔ میں ساری بات سمجھ گیا تھا کہ وہ اب نہ ملک سے باہر جاسکتا ہے نہ وہ واپس اپنے ملک جاسکتا ہے کیونکہ وہ ایک راز ہے اور کوئی ملک اپنا راز اپنے ملک کی حدود سے باہر نہیں جانے دے سکتا۔ ہرپچن سنگھ یہ بات اور اپنی غلطی سمجھ چکا تھا۔ میں گاہے بگاہے اُس سے ملنے جاتا تھا۔ وہ فون کرسکتا تھا۔ کھانے بناسکتا تھا۔ لاہور میں گھوم سکتا تھا۔ مگر ظاہر ہے اُس پر نظر رہتی تھی کیونکہ وہ راز تھا۔ اس کے گھر کے کچھ لوگ سویڈن میں سیاسی پناہ لے چکے تھے۔ وہ سویڈن نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے پاس کسی بھی ملک کا پاسپورٹ نہیں تھا۔

میں کبھی کبھی ملتا تو مجھے بھی خوف آتا کہ کہیں میں دونوں ملکوں کی نظر میں مشکوک نہ ہو جاؤں۔ میں نے ملنا چھوڑ دیا۔ ایک دن اچانک ایک ریسٹورنٹ میں ملاقات ہوگئی۔ کہنے لگا ''مہاراج آپاں جے پاگل خانے وچ ہوندے تاں ٹوبہ ٹیک سنگھ نمبر کے پاگلاں دے ہوارے اج انڈیا دے حصے آجاندے۔''

میں نے اُسے کہا کہ لاہور خوبصورت شہر ہے۔ اسے اپنا گھر سمجھو۔ مٹن کڑاہی اور چکن تکہ تو آپ کو پسند ہے۔ میری مانو تو ایک ڈھابہ کھول لو۔ وقت بہل جائے گا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں کیوں ایسا کہہ رہا ہوں۔ میرے پاس کوئی مرہم اُس کے لیے نہیں تھا۔ اب وہ صرف اپنے مرنے کا انتظار کررہا تھا۔ کہتا تھا کاش میں جنگی قیدی ہوتا تو کسی نہ کسی دن تو جنیوا کنونشن کے ذریعے اپنے ملک واپس چلا جاتا۔ اب تو میرا سٹیٹس کچھ بھی نہیں۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ تم دو ملکوں کی لڑائی میں گھاس ہو۔ تم دو

ملکوں کی سرحد پر تو یہ ٹھیک سنگھ ہو۔

پھر وقت کے ساتھ ساتھ میں اُسے بھول گیا۔ وہ میرے حافظے سے پھسل گیا۔ میں اس دوران ہر سال انڈیا آتا جاتا رہا۔ کبھی اُس کا خیال نہ آیا ایک دن اچانک.....

ہاں وہ بھی ایک خاموش دن تھا۔ کسی مجرم کو کسی جیل میں پھانسی نہیں ہوئی تھی۔ کوئی بڑا حادثہ نہیں ہوا تھا۔ سفید کپڑوں میں ایک اہلکار میرے پاس آیا اور پیغام دیا کہ گربچن سنگھ جس کے تین نام تھے۔ کل گزر گیا ہے۔ تب حافظے میں وہ سات فٹ کا سردار سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اہلکار نے اُس کی وصیت بتائی کہ میری راکھ میری بہن دلجیت کور کو دے دی جائے اور آپ کا نام لیا ہے کہ ان کو دے دیں وہ یہ کام کر دیں گے۔ آپ کا آخری وقت میں بہت ذکر کرتے رہے ہیں۔ یہ ان کی امانت ہے اور یہ پتہ ہے یہ کہہ کر اہلکار چلا گیا۔

سکھی سنگھ نے سکھ کا سانس لیا کہ ایک اور کہانی کا انتم سنسکار ہو گیا ہے۔ میں نے سکھی سنگھ سے کہا تم اب یہیں رکو۔ میں یہ امانت اکیلے دلجیت کور کو دوں گا۔ کوئی رابطہ درمیان میں نہیں ہونا چاہیے۔ سکھی سنگھ منہ دوسری طرف کر کے دس قدم پیچھے چلا گیا۔ میں نے پتے والے مکان پر دستک دی۔ میرے ہاتھ میں راکھ کا برتن تھا جو مٹی کا بنا ہوا تھا۔ مٹی کو مٹی ہی میں پیش کرنا چاہیے۔ اندر سے دلجیت کور سادہ سفید کپڑوں میں دروازہ کھول کر تیزی سے بولنے لگی۔ ''ویرا آ گیا ایں۔ ویر جہیں ویر لا دتی۔ اُڈ یک کے منڈیرے پنچھی وی پنچھاں لکو کے پراں ہیٹھ سوں گئے۔''

''آپ کو میرا انتظار تھا۔ کسی نے بتایا تھا کہ میں نے آنا ہے۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ویرا۔ میں تینوں کیہں ایس مٹی دے بھانڈے اچ مٹی ہوئے آ پڑیں ویر نال گل کیتی اے۔''

تب میں سمجھا کہ وہ تین ناموں والے اپنے بھائی سے بات کر رہی ہے۔

ویرا کیوں گیوں پردیس۔ کوئی کھائی سی تے ایتھے چھاتی گھٹ چے گئی۔ سی یا ویہڑا تنگ ہوگیا سی۔''

''بہن میں پاکستان سے آپ کے بھائی کی آخری رسومات کی راکھ لایا ہوں۔ یہ میرا فرض تھا کہ آپ تک پہنچاؤں۔''

''ویرا صبر کیہں ہوندا تینوں۔ ویراں دا جدوں انتم سنسکار ہوندا اے تاں دھرتی دا کالجا کنب جاندا اے۔ لیا دے مینوں میرا ویر میرے حوالے کر۔ میں رج کے گلاں کراں گی۔'' میں نے وہ مٹی کا برتن اسے دے دیا۔

دروازہ بند کرتے ہوئے اُس نے مجھے ایک طعنہ دیا'' جدوں کسے دے گھر آئی دا اے تاں پروہنا بن کے نئیں آ پڑاں نیز کے آئی دا اے۔''

میں نے محسوس کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ میرے پاؤں وہیں جم گئے۔ بالکل ٹوبہ ٹیک سنگھ کی طرح میں بھی جیسے سرحد پر کھڑا تھا۔ مجھے محسوس ہوا میں نے خوشونت سنگھ کی راکھ مٹی کی ڈولی میں ہڈالی ضلع سرگودھا پہنچا دی ہے۔ یہ راکھ کبھی ادھر سے اُدھر اور کبھی اُدھر سے ادھر آتی رہے گی مگر زیادہ سالوں تک نہیں۔ بس آخری ایک آدھ پاگل سردار باقی بچ گیا ہوگا۔

☆☆☆

سنجنا کی کہانی

ڈھاکہ میں امن لوٹ آیا تھا۔ لیکن امن کسی کی زندگی میں نہیں تھا ہر گھر نومبر 1971ء کے بعد بری طرح متاثر ہوا تھا۔ دو اوپر تلے کی نسلیں ذہنی جذباتی معاشی اور سماجی سطح پر شدید اضطراب اور بے یقینی کا شکار تھیں۔ اگر چہ آزادی کے اعلان کے بعد بنگلہ دیش وجود میں آ چکا تھا لیکن اُس کا ذائقہ ویسا ہی تھا جیسا پاکستان بننے کے بعد فیض صاحب نے کہا تھا۔

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

یہ ہندوستان میں ایک بٹوارے کے بعد دوسرا بٹوارہ تھا جس پر فیض صاحب کا شعر پورا اُتر رہا تھا۔ اگر چہ شہر کے حالات معمول پر تھے۔ پھر بھی کوئی ان دیکھا خوف جیسے موجود تھا۔ اخبار ہر روز نئی سے نئی کہانی سامنے لا رہے تھے۔ کچھ دانشور تو ابھی تک مشرقی پاکستان کے ناسٹلجیا میں رو رہے تھے اور کچھ دانشور مغربی پاکستان کی نفرت سے ابھی تک چٹخارا لینے میں مصروف تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کھل چکی تھی لیکن مغربی پاکستان سے آئے ہوئے طلبا موجود نہیں تھے۔ کیمپس میں کشیدگی تھی۔

بہاری طلبا اور مغربی پاکستان کے حامی طلبا کو روپوشی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ حالات سنبھل تو رہے تھے لیکن غم و غصے کی لہر بہت سست روی سے نیچے آ رہی تھی۔

یہ 1972ء کا کوئی موسم کوئی دن ہوگا کہ ایک ہندو بنگالی لڑکی ڈھاکہ میونسپل کارپوریشن کے اُس شعبے میں آئی جہاں بچوں کا اندراج ہوتا تھا۔ وہاں رش لگا تھا۔ رجسٹر میں والد کے اندراج میں زیادہ تر نامعلوم لکھا ہوا تھا۔ اندراج کرنے والوں کو معلوم تھا کہ نامعلوم کا مطلب کیا ہے۔ ڈھاکہ اور دوسرے شہروں میں ان رجسٹروں میں نامعلوم معمول کی بات تھی۔ لیکن جب ہندو بنگالی لڑکی سانولے رنگ، تیکھے نقوش، خوبصورت بڑی آنکھیں، کمر سے نیچے تک لمبے بال، خوبصورت اُبھرے اعضا کا بدن لے کر آئی تو لوگوں کی نگاہیں دیکھتی رہ گئیں۔ اُس کا نام مالتی تھا۔ لگتا تھا ڈانس سکول سے ابھی ابھی نکل کے آئی ہے اور سچائی بھی یہی تھی۔ مالتی بنگال کے ڈانس سکول میں فوک ڈانس اور کلاسیکل ڈانس کی اُستاد تھی۔ عمر کوئی پچیس سال رہی ہوگی۔ ڈانسر کے جسم کو سوکوس تک اُڑنے والے پکھشی کے جسم سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ مالتی نے اپنی بیٹی سجنا کے نام کا اندراج کرانا تھا۔ کلرک نے پوچھا نام مالتی نے کہا سجنا۔ مذہب کیا ہے؟

مالتی چونکی اور بولی کہ اس طرح کا پہلے تو کوئی خانہ اندراج میں موجود نہیں تھا۔ کلرک نے لاپروائی سے فوراً جواب دیا "اے تم کو معلوم نہیں اب بنگلہ دیش بن گیا ہے۔ مذہب معلوم؟ مطلب مذہب ہوتا ہے۔ بولو کیا لکھوں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی۔"

"میرا مذہب ہندو لکھو۔ میری بیٹی سجنا کا مذہب مسلمان لکھو۔"

اب وہ چونکا مالتی کو دیکھا۔

''تو یہ کس طرح ہوگا ماں کا مذہب اور بیٹی کا اور۔''

''اس لیے کہ اس کا باپ مسلمان ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ نام بولو باپ کا۔''

''کیپٹن عمران ملک۔''

اس پر کلرک کا ماتھا ٹھنکا۔ اور وہ بولا'' باپ کہاں ہے اُس کا پتہ بولو۔''

''وہ جیل میں ہے۔'' مالتی نے بتایا۔

''کس جیل میں ہے؟ جرم کیا ہے۔''

''وہ ہندوستان کی جیل میں ہے۔'' مالتی نے کہا۔

''ہندوستان کی جیل میں کیوں ہے۔''

''اس لیے کہ وہ مغربی پاکستان کی فوج میں تھا اور اُسے جنگی قیدی بنایا گیا ہے۔''

''مغربی پاکستان کا فوجی افسر جنگی قیدی نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟''

''ہاں وہی سجنا کا باپ ہے۔''

''اس کا مطلب ہے ریپ ہوا ہے؟ تو ایسے بولو ناں تا کہ ہم اُسے جنگی جرائم میں رجسٹر کریں۔''

''نہیں میرا ریپ نہیں ہوا ہے۔''

''تو پھر یہ لڑکی کیسے پیدا ہوئی۔ کوئی میرج سرٹیفکیٹ ہے؟''

''میرج سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔ کیا بچی کے اندراج کے لیے ضروری ہے۔''

''نہیں ضروری نہیں ہے۔''

''تو پھر درج کرو سجنا ولد کیپٹن عمران ملک۔''

''نہیں یہ ایسے درج نہیں ہوگا۔ پہلے آپ بتائیں کہ کیپٹن عمران ملک نے آپ کا ریپ کیا تھا۔''

''میں نے بتایا اُس نے مجھے ریپ نہیں کیا تھا۔''

''تو پھر کیا تم نے شادی کی تھی۔''

''ہاں یہ بات میں بتانا چاہتی ہوں کہ میں ڈانسنگ سکول کی ٹیچر ہوں۔ جب مغربی پاکستان سے فوجی ادھر آئے تو سارے فوجی ہم پر حملہ کرنے نہیں آئے تھے۔ وہ اپنی ڈیوٹی کرنے آئے تھے۔''

''جلدی بولو کہ پاکستانی فوجی نے زبردستی تم کو حاملہ کیا؟''

''نہیں اُس نے زبردستی نہیں کی تھی؟''

اس بات کی کلرک کو سمجھ نہ آئی۔ تو وہ غصے سے بھر گیا۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''جو میں کہنا چاہتی ہوں۔ تمہیں سمجھ نہیں آسکتی۔''

''تو پھر میں ولد نامعلوم لکھ دیتا ہوں۔ تم سے پہلے بھی کئی عورتوں نے یہ لکھوایا ہے۔''

''لیکن اس کا والد نامعلوم نہیں ہے۔ میں بتا رہی تھی کہ وہ مجھے پسند کرتا تھا۔ اس نے میرا ڈانس دیکھ لیا تھا اور وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔''

''شادی کی تو نہیں۔ اس طرح تو وہ نامعلوم ہی ہوگا ناں۔''

''نہیں ہماری دوستی تھی، جس رات ہماری شادی مطلب جیسی بھی ہوئی تھی اس رات میری وجہ سے اُس کا کورٹ مارشل ہوگیا۔''

''دیکھو ہندوؤں میں بھی سات پھیرے تو ہوتے ہیں ناں۔ میری طرف

سے نامعلوم ہوگا۔''

''دیکھو ہمارا آپس میں دل مل گیا تھا۔ وہ دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔ یہ بچی اُسی کی ہے کہ ہم نے دل سے ایک دوسرے کو قبول کر لیا تھا۔ کرفیو میں شادیاں ایسے ہی ہوا کرتی ہیں۔''

''کرفیو میں شادیاں ہوتی ہی نہیں ہیں۔ یہ نامعلوم ہی لکھا جائے گا۔''

''کرفیو میں ریپ ہوسکتا ہے، گینگ ریپ ہوسکتا ہے تو شادی کیوں نہیں ہوسکتی۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں ریپ ہوسکتا ہے۔ شادی نہیں ہوسکتی۔ تو اسے ریپ ہی سمجھا جائے گا۔''

''یہ فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔ بھگوان نے یہ حق ماں کو دے رکھا ہے لکھو ولد میجر عمران ملک۔''

اب کلرک نے مالتی کو سمجھایا ''مالتی دیدی بات کو سمجھو۔ اگر اس نام کے ساتھ تمہاری بچی سکول اور کالج جائے گی تو سب کی نفرت اور غصے کا نشانہ بنے گی۔ اُسے کوئی سکول داخلہ نہیں دے گا۔ تم سمجھتی کیوں نہیں۔ اس نام کے ساتھ تمہاری بچی بنگلہ دیش میں نہیں رہ سکتی۔ اسے کسی اور ملک بلکہ پاکستان میں لے جاؤ۔''

''یہ میرا اپنا ملک ہے۔ میں اسے کیوں چھوڑوں۔''

''تو پھر یاد رکھو یہ مسلمان ملک بھی ہے اور بنگلہ دیش بھی ہے۔ اسی بات پر تمہیں سنگسار کر دیں گے۔ میری بات مان کر اسے تم نامعلوم ولدیت کے ساتھ درج کرادو۔ بے شمار بچے اسی طرح کے ہیں۔ اسے ہمدردی بھی ملے گی اور کوئی نفرت نہیں کرے گا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لوگ نفرت نہ کریں۔ اسے معاشرے میں حرامزادی کے نام سے پکارا جائے گا۔ میں یہ نہیں چاہتی۔''

''تو پھر کسی بنگالی ہندو سے شادی کر لو اور اس لڑکی کو اُس کا نام دے دو۔''

''میں کیوں کسی اور سے شادی کروں۔ میری شادی اُسی سے ہو چکی ہے۔ اب اس کی بیٹی پالوں گی۔''

''تو پھر یہ بات بھی کسی کو نہ بتانا۔ تمہارا گھر جلا کر اندر ہی تمہیں جلا دیں گے۔ بولو اب کیا لکھنا ہے۔''

''مالتی نے سوچا۔ پھر مڑ کے دیکھا تو کچھ لوگوں نے لائن لگا رکھی تھی۔ ان میں سے ایک بولا فیصلہ جلدی کرو۔ جب باپ کا پتہ نہیں تو بحث کی بات کیا۔ بنگلہ دیش جب بنا ہی کرفیو کی راتوں میں ہے تو پھر اس طرح کے بچے تو پیدا ہوں گے۔''

مالتی اُٹھی اور بولی'' جو لکھنا ہے لکھ لو۔ بھائی۔ ہمارا بے بی تو ہو بہو باپ کی شکل ہے۔ بڑی ہو گی تو ویسے ہی تم پہچان لو گے کہ کس کی بیٹی ہے۔''

کہانی میرے پاس آئی۔ وہ کھڑکی میں بیٹھی مجھے گھور رہی تھی۔ میں نیند سے جگا تھا۔ مجھے وہ میری پالتو بلی کی طرح دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے اُسے پاس بلایا کہ تم کہاں چلی گئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ بنگلہ دیش میں تھی۔ اب وہاں سے تحفہ لائی ہوں۔ میں نے کہا مجھے معلوم ہے۔ خواب میں بھی کہانی ہی ہوتی ہے۔ جو مجھے بتاتی ہے کہ کیا ہوا ہے؟ کہانی نے مجھے پھر چونک کے دیکھا اور کہا'' خواب میں بھی کہانی آئی ہے۔ تو وہ کون ہے۔ میری ہم زاد ہے۔''

''نہیں۔ جواب میں بھی تم ہی ہوتی ہو۔ جو باتیں تم دن میں نہیں بتا سکتی وہ خواب میں آ کر بتا دیتی ہو۔''

''تو پھر مالتی کا کیا ہوا اور اُس کی بیٹی سنجنا کا کیا ہوا؟''

''وہ اب تم بتاؤ گی کہ بنگلہ دیش بن گیا۔ میجر عمران ملک کا پہلے کورٹ مارشل ہوا اور پھر وہ جنگی قیدی بن کر انڈیا کی کسی جیل میں چلا گیا۔''

کہانی نے کہا تم اب بہت سمجھدار ہو چکے ہو۔ میرے محتاج نہیں رہے۔ اب تم کہانی کو خود آگے بڑھاؤ۔ میں تمہاری مدد نہیں کروں گی۔ میں نے کہانی کا یہ چیلنج لے لیا اور آگے اب کہانی میرے ساتھ نہیں ہوگی۔ البتہ وہ بلی کی طرح میری نگرانی کر رہی ہوگی۔

تو پھر یوں ہوا کہ مالتی کی بیٹی سنجنا نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھ لیا۔ مالتی ڈانس سکول سے تھیٹر سکول میں چلی گئی۔ اُسے اپنا کام آتا تھا سو اُس کو روٹی روزی کی فکر نہ رہی آج اس شہر میں کل نئے شہر میں۔ وہ اپنا آرٹ دکھانے کے لیے بنگلہ دیش کے تھیٹر گروپس میں شامل ہوگئی۔ سنجنا سکول میں گئی تو اُس کی کلاس میں تین نامعلوم ولدیت کی لڑکیاں تھیں۔ تینوں سکول میں اکٹھی رہنے لگیں اور تینوں آدھی چھٹی کے وقت اپنے کلاس روم میں ہی خود کو محفوظ سمجھتی تھیں۔ باقی بچیاں بھاگ کر باہر جاتی تھیں۔ خوب ہلا گلا کرتیں۔ کھاتی پیتیں اور سپورٹس گراؤنڈ میں اُچھل کود کرتی تھیں۔ مگر سنجنا اپنے اندر گم رہتی۔ مالتی معاشی طور پر کوشش کر رہی تھی کہ اپنی بیٹی کو وہ بہت اچھی تعلیم دے کے اس قابل کرے گی کہ وہ اپنے باپ کے قابل بن سکے۔ لیکن اُس کا باپ میجر عمران ملک کہاں تھا؟ وہ کسی کو یہ بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ اُس کی بیٹی کا باپ پاکستان آرمی کا افسر تھا یا افسر ہے۔ اس لیے کہ اُس کا کورٹ مارشل صرف اس لیے ہوا تھا کہ وہ مالتی کو پسند کرتا تھا اور ہر رات اُس کے گھر میں ہوتا تھا۔ اب ایسا تو آرمی کے کوڈ میں نہیں لکھا ہوتا۔ اس لیے مالتی کے گھر سے میجر عمران ملک کو گرفتار کیا گیا کیونکہ

انٹیلی جنس نے ساری رپورٹ دینے کے بعد میجر عمران ملک کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا اور یہ وہ رات تھی جب سب لوگ جو سول اور ملٹری سے تعلق رکھتے تھے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں منتقل ہو گئے تھے تاکہ ڈھاکہ کے سقوط کے بعد معاملات کو نمٹایا جا سکے۔ مالتی کو معلوم ہو گیا کہ پاکستان آرمی اور پاکستان سے ڈھاکہ کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ صرف ڈھاکہ ہی نہیں پورے مشرقی پاکستان سے یہ رشتہ اب کبھی نہیں بنے گا۔ اس لیے اُس نے سنجنا کو سکول میں نامعلوم باپ کے ساتھ داخل کرا دیا۔ اب بچی نے سکول کی سطح پر احساس کمتری کا تعین اور لڑکیوں کے ساتھ سامنا کیا۔ لڑکیاں گزرتے ہوئے ریمارک پاس کرتی تھیں۔ یہ وہ ہیں جن کا باپ نہیں۔ جو بنگلہ دیش کی دشمن ہیں۔

سنجنا یہ سب سنتی رہتی تھی۔ لیکن ایک دن اُس نے ایک لڑکی کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔

''اسے تو کیا بولتی ہے۔ میرا باپ مغربی پاکستان کا میجر تھا۔ جس نے میری ماں سے محبت کی تھی۔ میری ماں اُسے میرا باپ کہتی ہے۔''

اس پر سب نے ہنسنا شروع کر دیا اور پھر سنجنا نے ماں سے پوچھا کہ میرا لیگل سٹیٹس کیا ہے۔ اس پر ماں نے بتایا کہ ہر لڑکی ایک ماں اور ایک باپ کی بیٹی ہوتی ہے۔ اس لیے لیگل یا Illigal کا سوال نہیں اُٹھتا۔ پھر بھی اگر تم سننا چاہتی ہو تو میں تمہارے باپ کے ساتھ اپنی مرضی سے سوئی تھی اور اس سے تم پیدا ہوئی ہو۔''

سنجنا خاموش ہو گئی مگر اُس کی خاموشی آواز بن کر اُس کے وجود میں پھیل گئی۔

اب جو سنجنا نے قد کاٹھ نکالا تو وہ لاکھوں میں پہچانی جاتی تھی۔ آنکھیں ماں پر گئیں، قد باپ پر، رنگت اور نقوش باپ کا عکس تھے۔ بنگال اور پنجاب کا حسین امتزاج اس میں آ گیا۔ جب اُس نے ماں کے آرٹ میں قدم رکھا تو پہلے ڈانس اور

پھر میوزیکل تھیٹر میں سنجنا اُبھر کر سامنے آ گئی۔ جسم کو مسلسل ڈانس کی ایکسرسائز نے اتنا متناسب کر دیا تھا کہ سنجنا پر نگاہ جمتی تھی تو جم ہی جاتی تھی۔ وہ اکثر کہتی ہیں تو سنگم ہے دو تہذیبوں کا۔ آدھی ہندو آدھی مسلمان۔ آدھی پاکستانی آدھی بنگلہ دیشی۔ آدھی بنگالن آدھی پنجابی۔

مالتی کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ سنجنا کے لیے رشتہ کہاں سے آئے گا۔ اُس نے یہ بات سنجنا پر چھوڑ دی کہ اُسے کوئی پسند آئے گا تو دیکھا جائے گا لیکن سنجنا کے پاس بہت سے سوال تھے۔ سب سے اہم یہ کہ اُس کے باپ نے اُن کی خبر کیوں نہ لی۔ اس بات پر مالتی نے اسے بتایا کہ تمہارا باپ جنگی قیدی اور پھر کورٹ مارشل کے بعد بنگلہ دیش کا ویزہ حاصل نہیں کر سکتا اور اُس کا یہاں آنا کسی بھی لحاظ سے اُس کی زندگی کے لیے محفوظ نہیں ہے اور اگر وہ کسی بھی طرح آ گیا تو اُس پر جنگی جرائم کا مقدمہ بھی چل سکتا ہے اور اُسے پھانسی کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔ اب دوسرا سوال تھا کہ وہ رابطہ تو کر سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے اُس نے کوشش کی ہو۔ مالتی بھی تو جگہیں بدلتی رہی تھی۔

مالتی نے ہندوستان کی قید سے رہا ہونے کے بعد اپنی ایجنسی کے ذریعے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو اُسے بڑی تگ و دو کے بعد یہ معلومات ملیں کہ ہندوستان سے رہائی کے بعد کورٹ مارشل پر عمل ہوا اور اس دوران اس کی بیوی نے اُس سے طلاق لے لی اور اُسے فوج سے نکال دیا گیا۔ اُس کے بعد وہ کہاں گیا یہ کسی کو علم نہیں ہے۔ مالتی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میجر عمران ملک کو تو پتہ ہی نہیں ہو گا کہ مالتی سے اُس کی کوئی بیٹی بھی ہے۔ وہ اس حقیقت سے پہلے ہی گرفتار ہو کر ہندوستان کی جیل میں پہنچ چکا تھا۔ جیل سے وہ خط لکھ سکتا تھا مگر ڈاک سنسر ہوتی تھی اور اس پر بنگالی عورت سے تعلق پر کورٹ مارشل کا مقدمہ چل رہا تھا۔

مالتی نے اب جدوجہد ترک کر دی تھی۔ کئی بار بنگلہ دیشی وزارتِ داخلہ کی جانب سے اُس کی طلبی ہوئی تھی اور اُسے شک کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا کہ کہیں اُس کے تعلقات میجر عمران ملک کے ساتھ تو نہیں ہیں یا ماضی میں کیا تعلقات تھے۔ وہ اپنا سچ بتا دیتی تھی۔ سجنا کو اب اپنے فن سے دلچسپی نے بہت کچھ بھلا دیا تھا۔ وہاں کی فلموں سے اُسے آفر آئی مگر چونکہ وہاں کی انڈسٹری بے حد کمزور تھی اور کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ وہاں جانے سے گریز کرنے لگی۔ البتہ ڈانس میں اس نے کلاسیکی بنگالی، فوک بنگالی اور بھارت ناٹیم کے اسالیب سیکھ لیے تھے۔ آہستہ آہستہ ترقی کر کے وہ پہلے تو علاقائی ثقافتی ٹروپے کا حصہ بنی اور پھر جب اُس کی شہرت نے پَر پھیلائے تو اُسے قومی ثقافتی ٹروپے میں شامل کر لیا گیا۔ اب اُس کی خواہش تھی کہ وہ بنگلہ دیش کے قومی دن پر پاکستان میں پرفارم کرے۔ ہو سکتا ہے اُس کی خبر اُس کے باپ تک پہنچ جائے۔

سجنا کو نیپال، تھائی لینڈ، انڈیا، سری لنکا، برما اور انگلینڈ میں قومی ثقافتی ٹروپے میں پرفارم کرنے کا موقع ملا لیکن پاکستان کے ساتھ تعلقات میں بے یقینی رہتی تھی۔ حالانکہ اقتصادی اور ادبی تعاون میں دونوں ملکوں کے وفد آتے جاتے رہتے تھے۔ سارک ممالک میں بھی وفود آ جا رہے تھے لیکن پاکستان میں اُسے پرفارم کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ بالآخر سارک ملکوں کی کانفرنس میں اُسے پاکستان جانے کا موقع مل گیا۔ اُس نے اپنے سفارت خانے کے ملٹری اتاشی سے ملاقات کی اور بتایا کہ وہ عمران ملک جو سابق آرمی میجر تھا کے متعلق جاننا چاہتی ہے۔ جس کی بیوی کو طلاق ہو گئی تھی اور وہ شاید اسلام آباد میں رہتی ہے۔ بنگلہ دیشی ملٹری اتاشی نے بہت کوشش کی تو اُسے یہ اطلاع ملی کہ میجر عمران ملک کی بیوی کسی بڑی بزنس فیملی سے تعلق رکھتی

تھی۔ جونہی ڈھاکہ میں ایکشن شروع ہوا۔ وہ لاہور میں تھی۔ جونہی کورٹ مارشل کی خبر آئی۔ اُس کی فیملی نے عدالت سے رجوع کیا اور خلع کی درخواست دے دی۔ جس پر عمل اُس وقت ہوا جب ہندوستان کی قید سے عمران ملک کو رہائی ملی اور فوج سے انہیں نکال دیا گیا۔ اس کے بعد ان کی بیوی نے ایک بڑے بزنس مین سے شادی کر لی تھی اور اب وہ دبئی میں ہے۔ سجنا نے بہت کوشش کی کہ وہ عمران ملک کے متعلق کچھ بتائے۔ اس نے بات سننے سے انکار کر دیا اور کہا وہ کچھ نہیں جانتی۔

اب سجنا نے ایک کوشش پاکستان آرمی کے ریکارڈ تک رسائی حاصل کر کے معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا اُس کی فیملی پاکستان چھوڑ چکی ہے۔ آگے کی کسی کو خبر نہیں تھی۔ بات گویا ختم ہو گئی۔ سجنا بنگلہ دیش واپس چلی گئی۔ اُس کا قومی ٹروپ مختلف ملکوں میں آتا جاتا رہا۔ اس دوران اُس کی ملاقات نیپال ایمبیسی کے افسر مستفیض سے ہوئی جو فارن آفس کا ملازم تھا۔ وہ نیپال کے شہر کھٹمنڈو میں ایک سرکاری تقریب میں پرفارم کر رہی تھی۔ مستفیض پہلے سے اُسے جانتا تھا مگر اب اُس نے کچھ وقت سجنا کے ساتھ گزارا تو اُسے دل دے بیٹھا۔ اُس نے اُسے کھٹمنڈو کے ہائی ایٹ ہوٹل کے خوبصورت لان میں پرپوز کر دیا۔ رنگت سانولی مگر نقوش اُبھرے اُبھرے۔ قد بس مناسب تھا لیکن فارن سروس کے افسر ہونے کی وجہ سے بہت ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ سجنا نے سوچا اب ٹروپ میں اُس کا کیریئر ختم ہونے لگا ہے۔ نئی نئی لڑکیاں مختلف ڈانس کلبوں سے آنے لگی تھیں۔ سجنا کا کیریئر بہت دیر تک چلنے کی وجہ سے اس کی خوبصورت اور سراپا کے ساتھ فن پر قدرت بھی تھی۔ لیکن اب وہ ڈانس سکھانے میں زیادہ دلچسپی رکھتی تھی۔ اُس نے مستفیض سے شادی کا فیصلہ کر لیا اور اُسے بتایا کہ اُس کی ولدیت نامعلوم ہے۔ کیا اس کے باوجود بھی تم مجھ سے شادی کرو گے اور تمہارا فیملی اس

بات کو کیسے قبول کرے گا۔ مستفیض نے بتایا کہ وہ سجنا کے متعلق سب معلومات رکھتا ہے اور فارن آفس میں ہونے کی وجہ سے وہ تمام واقعات جانتا ہے اور پھر اُس کی جسمانی ساخت بھی کچھ پیغام دے رہی ہے تو حقیقت جاننا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ وہ اس حقیقت کے باوجود اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ فیملی کو بھی سب معلوم ہے اور خود اُس کی فیملی کو بنگلہ دیش کی آزادی کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔

مالتی نے اس رشتے کو قبول کرلیا کہ اُس کی صحت مسلسل گر رہی تھی۔ شادی کے بعد سجنا ٹروپے کو خیر باد کہہ کر اپنے گھر پر ڈانس کی کلاسیں لینے لگی۔ ڈھاکہ میں اب بھی لڑکیوں کو ڈانس کی تربیت حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ بنگال کی روایت اُسی طرح چل رہی تھی۔ مستفیض کا سرکاری کیریئر شاندار تھا۔ وہ ایک محنتی ڈپلومیٹ تھا اور سجنا چونکہ اُس سے کم پڑھی لکھی تھی اس لیے وہ سلیقہ مندی میں بہت آگے تھی۔

سجنا نے مستفیض کی سرکاری پارٹیوں کو چار چاند لگا دیے کیونکہ وہ مشہور ڈانسر تھی۔ لیکن اب اُس کی لڑکیاں ان پارٹیوں میں اپنے فن کا جادو جگاتی تھی۔ سجنا کی وجہ سے مستفیض کو سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں عزت کے ساتھ بلایا جاتا تھا۔ سجنا چونکہ دنیا گھوم چکی تھی اس لیے جہاں بھی مستفیض کی پوسٹنگ ہوتی سجنا کے دوست پہلے سے موجود ہوتے تھے۔ اس طرح یہ آئیڈیل جوڑی قرار پائی۔

مالتی نے جب یہ دیکھا کہ اُس کی بیٹی جو مغربی پاکستان کی بیٹی ہے یہاں سے عزت لے رہی ہے جیسے فلم سٹار شبنم پاکستان میں عزت لے رہی تھی تو مالتی جو شبنم کی ساتھی تھی، خوش ہوگئی۔ اب سجنا کے خاوند کی پوسٹنگ پاکستان میں ہوئی تو وہ اب بہتر ڈپلومیٹک پوزیشن میں تھی۔ وہ مختلف تقریبات میں آ جا رہی تھی اور اُس کے دماغ

میں اُس کی ولدیت تھی۔ وہ اپنے باپ کو سامنے سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اُس نے اپنے گھر پر شوقیہ ڈانس سیکھنے والی لڑکیوں کو تربیت دینا شروع کر دی تھی۔ اسلام آباد بھی مشرقی پاکستان کے افسروں کا گھر ہوا کرتا تھا۔ اب وہ ایک سفارتخانے میں محدود ہو چکے تھے۔ اپنے گھر میں اجنبی ہونا بھی کیا تجربہ ہے۔ کبھی اسلام آباد میں ان بنگالی افسروں کے گھر میں روزانہ موسیقی بجتی تھی باپ ستار بجاتا تھا بیٹی گاتی تھی۔ اس لئے سنجنا نے اُسی روایت کو اپنی ایمبیسی کے گھر میں دوبارہ زندہ کر دیا تھا۔ شروع میں دو لڑکیاں آئیں ایک ایسے گھر سے تھی جس کی ماں کو طلاق ہو گئی تھی اور وہ کسی این جی او میں کام کر رہی تھی۔ لڑکی ماں کے پاس رہتی تھی اور کسی یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی لیکن وہ خود سے کچھ بننا چاہتی تھی۔ دوسری لڑکی ایک بیوروکریٹ کی بیٹی تھی جسے ماں نے اس لیے ڈانس کی تربیت کے لیے داخل کرایا کہ وہ اپنا فگر خراب کر رہی تھی۔ برگر اور چاکلیٹس میں پھنسی ہوئی تھی۔ سنجنا کو ساری سمجھ تھی اس لیے اُس نے ڈانس کی تربیت کے ساتھ ذہنی تربیت بھی جاری رکھی۔ اوپر سے خوبصورت بلا کی تھی تو لڑکیاں اُس کے جادو میں پگھلی ہوئی تھیں۔

سنجنا کی شہرت سوشل میڈیا پر بھی نکلی اور زبانی کلامی بھی بات پھیل گئی تو لڑکیوں بلکہ آنٹیوں کی قطار لگ گئی۔ اُس نے صرف بارہ لڑکیاں منتخب کیں کیونکہ وہ ایک ہی کلاس بنا سکتی تھی اور بارہ سے زیادہ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی تھی۔ جب اُس نے سب کا آگا پیچھا دیکھا تو اُن میں سے ایک ریٹائرڈ جنرل کی بہو تھی۔ ڈانس کلاس کے بعد سنجنا نے اُسے روک لیا۔ جنرل صاحب کی بہو بھی کسی جنرل کی بیٹی بھی تھی۔ سنجنا نے اُسے اپنے پاس بٹھایا اور کہا دیکھو آپ کے والد یا آپ کے سسر میں سے کوئی 1971ء کی جنگ میں پی او ڈبلیو بنا تھا۔ مطلب جنگی قیدی؟ تو اُس لڑکی نے

کہا" میں اس سیاپے کے بعد پیدا ہوئی تھی۔" "سیاپا کا مطلب؟" سجنا نے کہا۔

"سیاپا مطلب رولا۔"

"رولا کا مطلب۔" سجنا نے پوچھا۔

"مطلب یہ جو کچھ بھی بنگلہ دیش میں ہوا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ مشرقی پاکستان اور ڈھاکہ فال کو سیاپا یا رولا سمجھتے ہو۔"

"نہیں میڈم۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"او کے۔ تمہارے ڈیڈی اور تمہارے انکل دونوں جنرل ہیں۔ تو کیا تم اُن سے پوچھ سکتی ہو کہ اُن میں سے کوئی جنگی قیدی بنا تھا۔" سجنا نے پوچھا۔

"میڈم میں پوچھ کے بتاؤں گی۔"

"او کے ویسے تمہاری ممی نے کبھی تم سے کہانیاں نہیں کہیں۔"

"نہیں۔ کہانیاں تو ہم کارٹون میں دیکھتے ہیں۔"

"او کے۔ اگر تمہاری ممی یا آنٹی نے کبھی یہ بتایا ہو کہ آپ کے فیملی کے ساتھ کوئی ٹریجڈی ہوئی تو وہ کیا تھی؟"

"میڈم ٹریجڈی کا تو پتہ نہیں۔ مگر ہمارے امی ابو ہم سے زیادہ بات نہیں کرتے۔ وہ گالف کھیلتے ہیں۔ مارننگ واک کے بعد جوس پیتے ہیں اور پھر اپنے کلب جا کر چیٹنگ کرتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں۔ رات کو آتے ہیں۔"

"او کے گرلز اگر تم کو پتہ چل جائے کہ ان میں سے کوئی جنگی قیدی ہندوستان میں تھا تو مجھے بتانا۔"

بات ختم ہوگئی۔ مگر تیسرے دن اُن میں سے ایک کا باپ سجنا سے ملنے

آ گیا۔ جس کو کہتے ہیں ناں ماتھا ٹھنکا تو اُس کا ماتھا ٹھنکا اور وہ آ گیا۔

سجنا سے اُس نے پوچھا "آپ کس کی بات کر رہی تھیں۔"

سجنا نے کہا "میں تو صرف یہ پوچھ رہی تھی کہ کیا آپ اُس آرمی ایکشن میں مشرقی پاکستان میں تھے؟"

"ہاں میں تھا۔ بلوچ رجمنٹ کے ایک یونٹ میں تھا۔"

"تو پھر کیا اس میں میجر عمران ملک بھی تھا۔"

اب تو اُس جنرل کا ماتھا نہ صرف ٹھنکا بلکہ انتظار حسین کی طرح ٹھنکا۔

"ہاں میں میجر عمران ملک کے ساتھ تھا۔ اُس کا جس رات کورٹ مارشل ہوا تھا۔ اُسے میں نے ہی گرفتار کیا تھا اور پھر ہم سب کو حکم ہوا کہ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں پہنچ جاؤ لیکن ہم سب کو پلٹن میدان میں بلایا گیا، جہاں ہم نے سرنڈر کیا۔"

"تو پھر میجر عمران ملک کہاں پر تھا۔"

"وہ آرمی کی تحویل میں تھا اور پھر مجھے نہیں معلوم اُسے کہاں پہنچایا گیا۔"

"مطلب یہ کہ وہ آپ کے ساتھ ہندوستان کی قید میں نہیں تھا۔"

"وہ ضرور قید میں ہوگا لیکن پچانوے ہزار فوجی قیدیوں اور کئی ہزار سویلین قیدیوں کو ایک جیل میں تو نہیں رکھا جا سکتا تھا۔"

"کیا انڈیا تیار تھا اتنے جنگی قیدیوں کو رکھنے کے لیے۔"

"انڈیا تیار نہیں تھا۔"

"تو پھر۔"

"تو پھر جنگی بنیادوں پر جیلیں خالی کرائی گئیں۔ معلوم نہیں میجر عمران ملک کس جیل میں تھا۔"

''تو جب آپ لوٹ رہا ہو کر مغربی پاکستان واپس آ ئے۔''

''تو اُس وقت مغربی پاکستان ختم ہو چکا تھا اور اُس کی جگہ پاکستان وجود میں آ چکا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے اُس رات مشرقی پاکستان ہی نہیں مغربی پاکستان بھی ختم ہو گیا تھا۔''

''ہاں حقیقت تو یہی ہے۔''ختم تو سب کچھ ہو گیا تھا۔

''دو قومی نظریہ بھی۔''

''یہ دو قومی نظریہ کیا ہوتا تھا۔''

''تم نہیں سمجھ سکتی۔ وہ تھا مگر بنگلہ دیش بننے کا سبب کچھ اور تھا۔''

''تو پھر میجر عمران ملک کے ساتھ کیا ہوا؟''

''بس پھر کورٹ مارشل کے بعد وہ فوج سے فارغ ہو گیا مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں، انھیں کیسے جانتی ہیں۔''

''میں ان سے نہیں ملی میں تو پیدا ہی بنگلہ دیش بننے کے بعد ہوئی تھی۔''

''تو پھر کیوں جاننا چاہتی ہیں۔''

''کسی کو اُس کی تلاش ہے۔ میں یہاں آئی تو مجھے اُس کا پتہ معلوم کرنے کے لیے کہا گیا۔''

''تو پھر وہ تو پاکستان میں نہیں ہے۔''

''آپ کے خیال میں وہ کہاں ہو سکتا ہے۔''

''وہ پہلے انگلینڈ میں تھا۔ پھر کسی نے بتایا وہ کینیڈا میں تھا اور وہاں اُس نے شادی کر لی تھی۔''

''شکریہ۔ اگر آپ کو اُن کا کوئی نمبر یا پتہ ملے تو پلیز مجھے بتائیں۔''

جاتے جاتے جنرل صاحب رُکے اور پوچھا ''جس بنگالی عورت کے ساتھ سکینڈل ہوا تھا، کیا آپ اُسے جانتی ہیں۔''

''ہاں میں جانتی ہوں۔''

''آپ شکل سے بنگالن نہیں لگتیں۔''

''آپ کا شکریہ جنرل صاحب۔ میرے باپ کے خانے میں نامعلوم لکھا ہوا ہے۔ اور میرے خاوند کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔''

''جنرل صاحب کو ہلکا پسینہ آیا اور وہ چلے گئے۔ اگلے دن سے اُن کی بیٹی ڈانس سیکھنے نہیں آئی۔''

اب سجنا اپنے خاوند مستفیض کی اگلی پوسٹنگ کے لیے سوچنے لگی کاش کینیڈا میں ہو جائے لیکن مستفیض نے اُسے بتایا کہ وہ کینیڈا میں اپنے سفارتکاروں کو معلومات حاصل کرنے کے لیے لکھ دیتا ہے کہ اس نام کا پاکستانی وہاں کہاں رہتا ہے۔ آج کل تو انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کا زمانہ ہے۔ چنانچہ یہ ذریعہ بھی استعمال کیا گیا۔ کوئی خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔ البتہ عمران ملک نام کے دس سے بارہ لوگوں کا پتہ مل گیا۔

یہ جو دس بارہ عمران ملک پیدا ہوئے تھے ان کی عمریں تیس سال سے پچاس سال تک کی تھیں۔ تو ان میں میجر عمران ملک نہیں ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی عمران ملک اتنا کامن نام ہے کہ دنیا میں کئی طرح کے عمران ملک پائے جاتے ہیں۔ سجنا نے فیس بک پر اپنا پیغام بھی چھوڑا لیکن شاید میجر عمران ملک فیس بک استعمال ہی نہیں کرتا تھا یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مر چکا ہو اور کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی اولڈ ہوم میں پڑا ہو۔ نہ بول سکتا ہو۔ نہ کچھ خبر رکھتا ہو۔ بس اسی طرح سجنا کے اندر اب اُس کی

تلاش کی خواہش کمزور پڑنے لگی۔ اُس کا ذہن تھا کہ میں اپنی ماں مالتی سے مسلسل رابطہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ مستفیض کی پاکستان میں پوسٹنگ کے دوران مالتی ایک دفعہ آ جائے۔ لیکن مالتی نے انکار کر دیا کہ وہ پاکستان میجر عمران ملک کے بغیر نہیں دیکھ سکتی۔ ہاں اگر عمران ملک مل جائے تو وہ اُسے ملنے آ سکتی ہے جس کی وجہ سے اُس کا کورٹ مارشل ہوا۔

سجنا کو پتہ تھا کہ اُس کا باپ بے وفا نہیں تھا۔ وہ مالتی سے محبت کرتا تھا۔ جو بھی حالات رہے ہوں گے۔ وہ ایک بار عمران ملک کو سننا چاہتی تھی جس کی وجہ سے اس کا ولدیت کا خانہ خالی رہا۔ خالی رہتا تو بھی ٹھیک تھا کہ کسی وقت وہاں باپ کا نام لکھا جا سکتا تھا۔ وہاں تو نامعلوم درج تھا۔

ایک دن مستفیض کو اپنے ایمبیسی اسلام آباد کے آفس میں ایک ای میل موصول ہوئی۔ جس میں لکھا تھا کہ بنگلہ دیش کا ایک بہت بڑا ثقافتی وفد کینیڈا جا رہا ہے جس کا انتظام بنگلہ دیش چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹریز نے کیا ہے جن کا خیال ہے کہ بنگلہ دیش کی کاٹیج انڈسٹری اور گارمنٹ انڈسٹری کے ساتھ چائے اور پٹ سن کی پراڈکٹ کو وسعت دینے کے لیے وہاں مارکیٹ کو فروغ دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے بنگلہ دیشی آرٹ اور کلچر کا ٹروپے جانا ضروری ہے تا کہ وہاں کی مارکیٹ کو متوجہ کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے ڈانس ٹروپے کی قیادت کے لیے قومی سطح پر خدمات انجام دینے کی وجہ سے سجنا کو اس ڈانس ٹروپے کی قیادت کے لیے تجویز کیا گیا۔ اس میں سجنا کے خاوند مستفیض کی ڈپلومیٹک حیثیت کا بھی دخل تھا چنانچہ سجنا اور مستفیض نے اس کو اپنے لیے اعزاز سمجھا اور اس طرح سجنا کینیڈا پہنچ گئیں۔ بنگلہ دیشی چیمبر آف کامرس نے ہر جگہ ثقافتی پروگراموں کے اشتہار ڈال دیے تھے۔ اخباروں میں، سوشل میڈیا پر

اور فیس بک پر اُن سب تقریبات جو پہلے ٹورانٹو میں ہو رہی تھیں کو مشتہر کر دیا تھا۔ ظاہر ہے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے رابطے بھی چھوڑ دیئے تھے۔ سنجنا نے جس ڈانس سکول سے تربیت لی تھی وہ اُس کی ماں مالتی کا ڈانس سکول تھا جہاں میجر عمران ملک نے اُسے دیکھا تھا اور محبت کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اور یہ ڈانس ٹروپ بھی اُسی سکول کا تھا جس کا ہر اشتہار میں ذکر تھا۔ ایسا محض اتفاقاً ہوا تھا۔ سنجنا کو اس حوالے سے کوئی خبر نہیں تھی۔

ٹورانٹو کے مرکزی علاقے کے مشہور ڈانس پرفارمنس کے آڈیٹوریم میں یہ شو ہونا تھا۔ سنجنا اپنی فنی مہارت کی وجہ سے لڑکیوں کو بھید بھاؤ اور سجاؤ کے ساتھ موسیقی سے ربط پیدا کرنے کے عمل کو دیکھ رہی تھی۔ اس ڈانس پرفارمنس میں بنگالی فوک اور کلاسیکل کو آپس میں فیوژن کیا گیا تھا۔ سٹیج پر رنگ بدلتے تھے۔ چاول کی فصل بوئی جاتی پھر تیار ہوتی تھی اور خوشی کا سماں ہوتا تھا۔ اسی طرح چائے کے باغوں میں لڑکیاں چائے چُنتی تھیں اور ڈھلان سے نیچے آتی تھیں اور آخر میں دریاؤں میں کشتیاں چلاتے ہوئے ''بندھورے'' کا مکمل مظاہرہ بھٹیالی کے ذریعے ہوتا تھا۔ یہ ایک مکمل ڈانس پرفارمنس تھی۔ سنجنا نے اس کی بھرپور تیاری کی ہوئی تھی چنانچہ جب اس ہال کی سٹیج کا پردہ ہٹایا گیا تو بنگالی میوزک اور ڈانس پرفارمنس نے قیامت ڈھا دی۔ سامعین میں پاکستانی، انڈین، یورپین، کینیڈین، افریقن اور بنگلہ دیشی باشندوں کے علاوہ جاپانی اور چینی باشندے بھی موجود تھے۔ سنجنا نے پورا شو اپنی مہارت سے مکمل کیا۔ لائٹ، ساؤنڈ اور سیٹ ڈیزائن سب اُس نے ترتیب دیا تھا۔ میوزک تو ایسے تھا کہ پچاس کے قریب سازندے موقع پر پرفارم کر رہے تھے۔

تمام فنکار سنجنا سے لپٹ گئے کہ وہ اُن کی ماں بن چکی تھی۔ مالتی کا فن ان نوجوانوں کی روح کی دھڑکن ہو چکا تھا۔ آڈیٹوریم خالی ہو چکا تھا۔ سٹیج پر آرٹسٹس

اور سنجنا ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے کہ ایک وہیل چیئر پر ایک خوبصورت آدمی جس کی عمر ڈھل چکی تھی۔ سٹیج کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی وہیل چیئر کو ایک گوری خاتون جو ظاہر ہے کینیڈین ہو گی لے کر آ رہی تھی۔ جب سٹیج کے پاس وہ وہیل چیئر رُکی تو سنجنا نے دیکھا اور وہ سٹیج سے نیچے اُتر آئی۔ وہیل چیئر پر بیٹھے آدمی نے اُسے دیکھا۔ وہ اُسے دیکھتا رہ گیا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور پھر وہیل چیئر پر بیٹھے آدمی نے کہا۔

''معاف کیجئے یہ ڈانس سکول وہی تھا جو مالتی کا تھا۔''

''ہاں یہ وہی ڈانس سکول ہے۔ آپ کون؟''

''نہیں میں تو بس ایک دیکھنے والا ہوں۔''

''تو پھر آپ مالتی کو کیسے جانتے ہیں وہ تو ماضی کی آواز ہے۔''

''مالتی...... بنگال کی آواز اور بنگال کی آبرو تھی۔''

''آبرو سے مراد۔ اتنی اُردو میں جانتی ہوں۔''

''بیٹی میں اپاہج ہو چکا ہوں اور اپاہج ہونے کی کئی ساری وجوہات ہیں۔ اب میں بجھارتیں نہیں بوجھ سکتا۔ یہ بتاؤ تم کون ہو۔''

''میں کون ہوں؟ کیا آپ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں جان سکتے۔''

چند لمحے وہ اپاہج مزید اپاہج ہو گیا اور اُس نے سنجنا کو دیکھا اور کہا۔

''مالتی نے تو بتایا نہیں کہ میری کوئی بیٹی بھی ہے؟''

''وہ کیسے بتاتی۔ آپ کا تو کورٹ مارشل ہو گیا تھا۔''

''تمہارا نام ماں نے کیا رکھا ہے۔''

''میں سنجنا ہوں بنگلہ دیشی ڈپلومیٹ کی بیوی ہوں۔''

''مالتی کہاں ہے۔''

''آپ مالتی کو کیسے جانتے ہیں۔''

''میں مالتی کو ڈھونڈ رہا ہوں وہ میری بیوی ہے۔''

''جھوٹ۔ اگر آپ نے ڈھونڈنا ہوتا تو اب تک اپنی کوئی خبر کیوں نہ دی۔''

''میں آ تو گیا ہوں۔ میں مالتی کے لیے آیا ہوں وہ کہاں ہے۔ مجھے ملا دو۔''

''میجر عمران ملک بہت دیر ہو چکی ہے۔''

''تم میری بیٹی ہو۔ تم ہی مالتی ہو۔ پلیز میری بات کرا دو مالتی سے۔''

''کس لیے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''میں اُس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں کہ میں نے اُس کی خبر نہ لی۔ میں شاید اُس کی خبر لے نہیں سکتا تھا۔ میری وجہ سے وہ وہاں حکومت کے عتاب کا نشانہ بن سکتی تھی اور ہو سکتا ہے جس مقام پر اب تم کھڑی ہو تم یہاں تک نہ پہنچ سکتی۔ یہ تم دونوں کے لیے اچھا تھا کہ میرا نام تم دونوں کے ساتھ نہ جڑتا۔''

ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ سجنا کا فون بجا۔ اُس نے دیکھا ڈھاکہ سے کال ہے۔ اُس نے فون کھولا۔

''ہیلو۔ ام بول رئی اے۔ کیا؟ کب؟ صبح کے وقت..... ام آئے گا۔''

''کیا ہوا؟ مالتی....''

''ماں آپ کو معاف کیے بغیر چلی گئی۔''

''کیا تم مجھے معاف کر سکتی ہو۔ میں اسی لیے ایسے وقت پر آ گیا کہ کوئی مجھے معاف کر دے۔''

''ماں کو کفن دینا ہے۔ مجھے جانا ہے۔ ہمیشہ کے لیے پردہ گر گیا ہے۔''

''میں کچھ کر سکتا ہوں؟ میں تمہیں نام دے سکتا ہوں۔''

''میں تمہیں اپنی پراپرٹی میں حصہ دے سکتا ہوں۔''

''میں نام نہیں لینا چاہتی۔ نا معلوم ہی میرے نام کے ساتھ رہے گا۔ جب پردہ گر جاتا ہے۔ روشنیاں بجھ جاتی ہیں تو تماشا ختم ہو جاتا ہے۔ تماشا دیکھنے والوں کو جانا ہوتا ہے۔''

سجنا سٹیج کے پیچھے چلی گئی۔ روشنیاں بجھ گئیں۔ اندھیرے میں وہیل چیئر واپس مڑی اور آہستہ آہستہ باہر چلی گئی۔

☆☆☆

ایک اور شہر افسوس

پہلا آدمی اس پر یہ بولا کہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے کہ میں مر چکا ہوں۔ تیسرا آدمی یہ سن کر چونکا اور کسی قدر خوف اور حیرت سے اُسے دیکھنے لگا مگر دوسرے آدمی نے کسی قسم کے ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا۔ حرارت سے خالی سپاٹ آواز میں پوچھا۔

''تو کیسے مر گیا۔''

پہلے آدمی نے اپنی بے روح آواز میں جواب دیا۔ ''میں انتظار حسین کے افسانے شہر افسوس میں مر گیا تھا۔ مگر مرتے مرتے بھی مجھے سے لگا تھا کہ شہر افسوس میں لاشیں ہی لاشیں تھیں اور عورتوں کے کٹے پھٹے اعضا ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔''

''پھر تم نے کیا کیا۔'' تیسرے آدمی نے پوچھا۔

''وہ سب دیکھتے دیکھتے ہی تو میں مر گیا تھا کیا تو نہیں مرا تھا۔''

''ہاں میں بھی مر گیا تھا۔ مگر میں نے جو دیکھا تھا وہ تو نے نہیں دیکھا تھا۔''

''کیا کہا؟ میں نے وہ نہیں دیکھا تھا جو تو نے دیکھا تھا۔ تو نے کیا دیکھا تھا؟''

''میں نے دیکھا تھا کہ روشن دماغ صحافیوں کی فہرستیں تیار کی جا رہی تھیں۔

میں وہاں موجود تھا۔ ان میں ایک نام شہید اللہ قیصر کا تھا۔''

''وہ کون تھا۔'' پہلے آدمی نے پوچھا۔

''وہ پاکستان کو پاکستان دیکھنا چاہتا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر پاکستان کو دو پاکستانوں میں پہلے بانٹا گیا۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کا نام دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ جب پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھرا تھا تو کیا وہ مشرقی اور مغربی پاکستان تھا۔ دنیا نے اُسے پاکستان تسلیم کیا تھا۔ کرنسی پاکستان کی۔ فوج پاکستان کی۔ ادارے پاکستان کے تھے۔ پھر یہ کس نے پاکستان کو پی آئی اے کے دو پروں میں تقسیم کر دیا۔''

تیسرے آدمی نے ٹوکا ''شہید اللہ قیصر کے ساتھ کیا ہوا؟''

وہ اُس فہرست میں آ گیا جو ان صحافیوں کی بنائی گئی جو پاکستان کو حقیقی پاکستان دیکھنا چاہتے تھے۔'' پھر کیا ہوا؟''

''پھر کیا ہوا'' تیسرے آدمی نے پوچھا۔

''پھر ایک رات اُس کے گھر پر دستک دی گئی۔ وہ باہر آیا اور جیپ میں اُسے بٹھایا گیا۔ پھر اُسے کسی نامعلوم مقام پر لایا گیا اور اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور اُسے کسی پدما یا کسی براہم پتر کے کنارے گولیوں سے بھون دیا گیا اور پدما اور براہم پتر کا پانی سرخ ہو گیا۔''

پہلے آدمی نے جب یہ کہانی سنائی تو دوسرا آدمی بولا تو پھر تم مر گئے۔

''نہیں میں نہیں مرا تھا۔ میں تو بہت بعد میں انتظار حسین کے شہر افسوس میں مرا تھا۔ انتظار حسین نے یہ بات نہیں بتائی تھی میں اب بتا رہا ہوں کہ شہید اللہ قیصر کیسے

مرا۔ اگر میں وہ سب دیکھ لیتا تو میں اُسی وقت مر جاتا۔''

''مگر اب تم کس طرح زندہ ہوئے ہو۔ تم تو عرصہ ہوا شہر افسوس میں مر چکے تھے۔''

''ہاں میں مر چکا تھا۔ لیکن اب دوبارہ زندہ ہو گیا ہوں۔ پوچھو کیوں اور کیسے؟''

''ہاں کیوں اور کیسے۔''

''وہ ایسے کہ یہ میرا دوسرا جنم ہے۔ اگر تم انتظار حسین کو پڑھ چکے ہو تو تمہیں دوسرے جنم کی بابت مجھے کچھ نہیں بتانا۔''

''ہاں یہ تو ہے۔''

اب پہلے آدمی نے سکھ کا سانس لیا اور گویا ہوا کہ ''شہر افسوس کوئی ایک نہیں ہوتا اور میرا جنم بھی کوئی ایک نہیں ہے۔ جیسے تمہارا جنم۔ اسی لیے تو کہتے ہیں جنم جنم کی ملاقات ہے۔''

''یہ تو ٹھیک بات کہی تم نے کہ جنم جنم کی ملاقات کا مطلب تو صاف ہے کہ بندے کا کوئی ایک جنم نہیں ہوتا۔''

''ہاں یہ تو ہے۔''

''پھر یہ تمہارا دوسرا جنم ہے۔''

''ہاں میرا دوسرا جنم ہے۔''

''یہ بتاؤ اگر یہ تمہارا دوسرا جنم ہے تو انتظار حسین کا بھی دوسرا جنم تو ہو سکتا ہے۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا۔''

''تو پھر وہ کہاں ہیں۔''

''ہوسکتا ہے وہ دوسرے جنم میں بندر بن چکے ہوں کیونکہ انہیں بندر بہت پسند تھے۔ یا وہ کسی اور شہر افسوس کے آخری آدمی بن چکے ہوں یا پھر وہ تھر پار کر کے مور بن چکے ہوں۔''

''ہاں بھئی یہ تو ہے۔''

''یہ تو آپ ایسے کہہ رہے ہو جیسے انتظار حسین بولتے تھے کہیں انتظار حسین کا دوسرا جنم تمہارا تو نہیں ہے۔''

''نہیں یہ میرا اپنا دوسرا جنم ہے۔ انتظار حسین کا نہیں۔''

''تو پھر بتاؤ تم اس شہر افسوس میں کیوں آئے۔''

''یہ میرا مقدر ہے۔ بھائی ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔''

''تو اس شہر افسوس میں تم زندہ کیسے ہو؟''

''میں زندہ نہیں ہوں۔ میں نے زندہ ہونے کا ناٹک کر رکھا ہے۔''

''مگر زندہ ہونے کا ناٹک کیسے کیا جا سکتا ہے۔''

''وہ ایسے کہ آپ تسلیم ہی نہ کریں کہ آپ مر چکے ہیں۔''

''مگر تسلیم نہ کرنے سے کوئی مردہ زندہ تھوڑی ہو جاتا ہے۔''

''ہاں اب تم نے اصل بات کی۔ اب ذرا مجھے بتاؤ اس پاکستان میں کتنے کروڑ لوگ ایسے ہوں گے جو زندہ نہیں ہیں پھر بھی وہ زندہ رہنے کا ناٹک کر رہے ہیں۔'' تیسرے آدمی کا ماتھا ٹھنکا کہ دوسرے آدمی نے کیسی بات کر دی ہے۔

مگر پہلے آدمی نے ایک عجیب نکتہ اٹھایا کہ بھائیو پہلے یہ طے کرو ہم اس دوسرے جنم میں کہاں ہیں۔''

اس پر سب سر بھوڑے کفنیاں گلے میں ڈالے بیٹھ گئے۔ چند لمحوں بعد جو اُن میں بزرگ تھا وہ بولا "صاحبو ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی آپ اپنی خبر نہیں آتی۔"

"تو گویا انتظار حسین بھی وہاں ہیں تو مسئلہ حل ہو گیا۔

"کیسے حل ہو گیا۔"

"ایسے کہ انتظار حسین عالم ارواح میں ہیں۔"

"مگر ہم تو عالم ارواح میں نہیں ہیں۔ اس کا مطلب ہے انتظار حسین یہیں کہیں ہیں۔"

"میں یہ نہیں جانتا میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم ایک اور شہر افسوس میں آ چکے ہیں۔"

"یہ کون سا شہر افسوس ہے۔"

"معلوم نہیں مگر یہ پتہ چلا ہے کہ دن رات یہاں خودکش حملے ہوتے ہیں۔ دھماکے ہوتے ہیں۔"

"ارے بھائی یہ خودکش حملے کیا ہوتے ہیں۔"

"یہ بات آسانی سے سمجھ نہیں آئے گی۔"

"تو پھر مشکل سے ہی سمجھا دو۔" تیسرے آدمی نے کہا۔

"بات یوں ہے کہ ایک حکمران پاکستان میں آیا تھا جس نے افغانستان میں طالبان سے محبت میں پاکستان کو امریکہ کے ہاتھوں میں گروی رکھ دیا تھا اور روس دشمنی میں امریکہ نے پاکستان کو صدیوں پیچھے دھکیل دیا۔ بدلہ شاید ذوالفقار علی بھٹو سے لینا تھا۔ بہر حال یہ بات اب ایک اور شہر افسوس کی ہو رہی ہے۔"

''تو کیا ہم اب ایک اور شہرِ افسوس میں دوسرا جنم لے کر پھر سے مرنے جا رہے ہیں۔''

''ہاں ایسا ہی ہے۔'' پہلے آدمی نے کہا۔

''تو پھر مجھے بتاؤ کہ کیا میں زندہ ہوں۔'' دوسرے آدمی نے کہا۔

''یہ تو منحصر ہے اس بات پر کہ تم نے کیا دیکھا۔''

''اے آدم زاد اب تم نے پوچھ ہی لیا ہے تو سن۔''

''میں سننے کی سکت ابھی بھی رکھتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں سننے کی سکت سے محروم ہو جاؤں تم بتاؤ کیا ہوا تھا۔''

''تو سنو میں کیسے مر گیا۔''

''ہاں تم کیسے مر گئے۔''

''ایک شام کو میں ایک میلے میں گم تھا۔ میلے کا سماں تو تم جانتے ہو۔ خلقت امڈی آتی تھی۔ کشتم پشتم میں بھی اُن میں شامل تھا۔ انبوہ کا انبوہ جیسے اُس میلے میں جوق در جوق شامل ہو رہا تھا۔ یہ کسی پیر بزرگ کا سالانہ عرس کا میلہ تھا۔ دھمالیں ڈالی جا رہی تھیں۔ چڑھاوے چڑھائے جا رہے تھے۔ دیے جلائے جا رہے تھے۔ مرشد پاک کی درگاہ پر زائرین کا کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ کٹورا پھینکو تو زائرین کے سروں سے برابر پھسلتا ہوا مرادوں والے آستان میں جا گرے اور خالی نہ رہے۔ تو بس اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور آگ لگ گئی۔''

''تو اُسی لمحے تو مر گیا۔''

''نہیں میں اب بھی نہیں مرا۔ میرے سامنے عورتوں لڑکیوں، بچوں اور بزرگوں کے جسم جل رہے تھے۔ مختلف اعضا بکھر رہے تھے۔ ایک عورت کا سر

میرے پاس آ کے گرا۔ پتہ ہے وہ کیا کہہ رہا تھا۔''

''مطلب سر بول رہا تھا؟''

''ہاں اس عورت کے سر کو دیکھا۔ وہ لا الہٰ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا ورد کر رہا تھا۔ وہ تن سے جدا ہو چکا تھا۔''

''تن سے جدا ہو چکا تھا۔ پھر بھی کلمہ پاک کا ورد کر رہا تھا۔''

''ہاں میں نے خود سنا اور دیکھا۔''

''اور پھر تو مر گیا۔''

''نہیں میں زندہ رہا۔ اور پھر میں نے دیکھا ایک بزرگ کا ہاتھ کٹا ہوا آن کر گرا۔ اس کی ایک انگلی بچے کے ہاتھ نے پکڑ رکھی تھی۔ دادا پوتے کا ہاتھ تھا۔ یہ مجھے ایسے لگا۔''

''تو پھر بھی زندہ رہا۔''

''ہاں میں زندہ رہا۔ مگر کتنا زندہ۔ یہ میں نہیں جانتا۔''

''پھر تو نے اور کیا دیکھا۔''

''ایک کان جس میں سونے کا بندہ تھا وہ میری جھولی میں آ کر گرا۔''

''وہ تم نے اُٹھالیا اور زندہ رہے۔''

''نہیں وہ میں نے نہیں اُٹھایا۔ وہ کوئی اور تھا جو جلدی سے اس پر جھپٹا اور وہ بُندے والا کان لے کر رفو چکر ہو گیا۔''

''پھر بھی تو زندہ رہا۔''

''ہاں مجھے کچھ کچھ یاد ہے کہ میں زندہ تھا۔''

''اور کیا دیکھا جس سے تمہاری موت واقع ہو گئی۔''

''کیا تم زندہ ہو۔ جو یہ سب پوچھ رہے
''کیا صرف زندہ آدمی ہی پوچھ سکتا ہے۔ مرا ہوا آدمی بھی تو بول سکتا ہے۔
ابھی تم بتا رہے تھے کہ اس عورت کا سر کلمے کا ورد کر رہا تھا۔''
''تو ایسا تو نہیں کہ ہم سب مر چکے ہوں اور پھر بھی بات کر سکتے ہوں۔''
''عزیزو۔ مرنے کی بھی ایک کہی تم لوگوں نے۔ مرنے کے لیے کیا کسی سے
اجازت لینی ہوتی ہے۔ وہ تو ایسے ہے کہ آدمی سوچتا ہے اور مر جاتا ہے۔''
''ہاں یہ تو ہے۔''
اب تیسرے نے کچھ کچھ اپنے اندر گدگدی محسوس کی اور بولا تو میاں کچھ اور
بتاؤ آخر اتنا بڑا عرس تھا۔ دھمالیں پڑ رہی تھیں اور دھماکہ ہو گیا تو ایسے میں تو بہت
ہڑبونگ مچی ہوگی آپادھاپی ہوئی ہوگی۔ بندے پہ بندہ گرا ہوگا۔ تو نے اور کیا دیکھا۔''
''میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ پوش بزرگ سفید بال کمر تک داڑھی ناف
تک۔ ماتم کرتا ہوا اُس اُجڑے صحن میں بول رہا تھا۔ میں کربلا سے آیا ہوں۔ سیدھا
یہاں آیا ہوں ایسا تو کربلا میں بھی نہ دیکھا۔ یہ ظلم تو یزید، حرمل اور شمر ملعون نے بھی نہ
کیا جو یہاں ہوا ہے۔ کربلا ہے کربلا ہے۔ ماتم ہے ماتم ہے۔''
''تو پھر تم مر گئے۔''
''نہیں میں نے اُس بزرگ کو سنا اور دو زانو بیٹھ کر گریہ کیا۔ میرے سامنے
ایک اجرک پڑی تھی جس کا آدھا حصہ جل چکا تھا۔ آدھا لہو میں تر تھا۔ میں نے محسوس
کیا کہ سندھو دریا کا پانی سرخ ہو رہا ہے اور پھر وہ سرخ ہو گیا۔''
''تو پھر بھی نہیں مرا۔''
''ہاں ابھی میرا سفر ادھورا تھا۔''

''تو پھر تو کب مرا۔''

''میرا دوسرا جنم تھا یا تیسرا معلوم نہیں کہ میں ایک اور زمانے میں اُتر گیا۔''

''کیا مطلب؟ گویا اب ہم زمان و مکان سے بھی نکل چکے ہیں۔''

''ہاں عزیزو ہم زمان و مکاں سے باہر ہیں۔''

''تو پھر تو کہاں پہنچا۔''

''وہ ایک اور طرح کا دیار تھا۔ سکول کے بچوں نے مل کر قومی ترانہ گایا۔ وہ سب ایک یونیفارم میں تھے۔ صبح سات بجے کا وقت تھا۔ ہال کمرے میں روشنی جو صبح کے سورج کی تھی چھن چھن کے آ رہی تھی۔ سب بچے اپنے اپنے دن کا آغاز اس ترانے سے کرتے تھے۔

''تو پھر کیا ہوا؟ کیا یہ اسی زمان و مکاں میں ہوا۔''

''ہاں ایسا ہی ہے۔ تو پھر اچانک سیاہ پوش حملہ آور بچوں کی اسمبلی پر گولیاں چلانے لگے اور کچھ دھماکے بھی ہوئے۔''

''بچوں پر اس طرح کا حملہ ہوا اور تو زندہ رہا۔''

''نہیں میں زندہ نہیں تھا۔ مگر میں مرا ہوا بھی نہیں تھا۔ کہیں درمیان میں معلق تھا۔''

''تو پھر تم نے اس منظر کو کیسے دیکھا۔''

''وہ ایسے کہ بچوں کا قتلِ عام کبھی تم نے سنا۔''

''نہیں سنا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔''

''تو اب ہوا اور میں نے دیکھا اور میں پھر بھی زندہ رہا۔

خون کے چھینٹے دیواروں پہ جہاں قرآنی آیات لکھی ہوئی تھیں اُن

گئے۔ پھر یوں ہوا کہ بچوں کے جسموں کے بے شمار اعضا میرے سامنے بکھرے پڑے تھے۔ میں نے یہ کیا کہ اُن اعضا کو جوڑ کر بچوں کے مکمل جسم بنانا شروع کر دیے۔ اس طرح میں نے سو بچے مکمل کر لیے۔ کسی کا ہاتھ کسی کا پاؤں کسی کا سر میں نے جوڑ دیا تھا۔ بچوں کے اعضا میں مماثلت کا میں نے خیال نہیں رکھا۔ سب بچوں کے رنگ گورے تھے۔ البتہ کوئی ذرا کم گورا تھا کوئی ذرا زیادہ گورا تھا۔ سب کے جسموں پر ایک سا یونیفارم تھا۔ اس لیے سو بچوں کے جسم اُن بکھرے اعضا سے مکمل کرنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ ہاں مگر کسی کا ایک ہاتھ دوسرے سے چھوٹا رہ گیا کسی کی ٹانگ دوسری سے چھوٹی رہ گئی تو وہ ایسے ہوا کہ آدھا بازو آدھی ٹانگ بارود سے اُڑ چکی ہو تو پھر اس طرح کا فرق تو پڑ ہی جاتا ہے۔

''تم نے سو بچوں کی لاشوں کو ایسے جوڑ دیا جیسے ٹوٹے ہوئے کھلونے کو جوڑا جاتا ہے اور پھر بھی تو زندہ رہا۔''

''ہاں میں نے سو بچوں کے جسم ثابت شکل میں جوڑ دیے اور میں زندہ رہا یا مردہ اس کی خبر نہیں ہے۔''

''پھر اُن بچوں کی ماؤں نے انہیں شناخت کر لیا؟''

''ہاں پھر یوں ہوا کہ شہر میں کہرام مچ گیا۔ وہ آہ و زاری اور گریہ ہوا کہ آسمان دہل گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں نے جن سو بچوں کو جوڑ کے مکمل کیا ہے، ان میں درحقیقت چار سو بچے سوئے ہوئے تھے۔''

''ایسا تجھے کب معلوم ہوا؟''

''ایسا اُس وقت ہوا جب بڑے ہال میں ہر میز پر بچوں کے ثابت جسم میں نے ترتیب میں رکھ دیے تھے۔''

اور پھر شہر بھر سے مائیں اور باپ اپنے اپنے بچوں کی شناخت کے لیے اُس ہال کمرے میں اُمڈ آئے۔ جہاں میں نے سو بچے مشکل سے مکمل کیے تھے۔ پھر ایک قیامت بپا ہوئی۔

ہر بچے کے گرد چار چار مائیں جمع ہو گئیں کسی نے اپنے بچے کا بازو شناخت کر کے بازو اٹھا لیا۔ کسی نے ٹانگ میں جراب کا سرا پہچانا اور اُسے دھڑ سے الگ کر کے گود میں رکھ لیا۔ اب ہر بچے کا ثابت جسم پھر سے اعضا میں تقسیم ہو گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ ان سو بچوں میں چار سو بچے شامل تھے۔ اب میزیں خالی ہو چکی تھیں سب اپنے اپنے بچوں کے اعضا پہچان کر لے گئے۔ جن ماؤں کو کچھ نہ ملا وہ کتابوں، کاپیوں اور لنچ بکس پہچان کر لے گئیں۔

ایک ماں نے اپنے بیٹے کا لنچ بکس کھولا۔ گرم پراٹھے میں آملیٹ لپٹا ہوا تھا۔ ابھی اس میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ وہ اٹھی اور اُس نے درخت پر بیٹھے پرندوں کو وہ کھانا ڈال دیا۔ پرندے اُس پر اُتر آئے اور چگنے لگے۔ ایک ماں نے اپنے بچے کا بستہ کھولا۔ ڈرائنگ کی کاپی نکالی اس میں تصویر بنی ہوئی تھی۔ ایک ماں۔ ایک باپ، ایک بہن اور آخر میں ایک تصویر کے نیچے لکھا تھا ''یہ میں ہوں۔'' ایک باپ نے اپنی بیٹی کا جوتا تلاش کر لیا مگر جوتے میں خون بھرا ہوا تھا۔ اُس نے خون سے لتھڑا جوتا صاف کیا اور چیخا ''یہ میری بیٹی ہے۔ اس جوتے میں میری بیٹی تھی۔ یہ اُسی کا ایک پاؤں ہے۔''

ایک خاتون کی لاش کے نیچے چار ننھے بچے دبے ہوئے تھے۔ جب اُس کی لاش کو اٹھایا گیا تو نیچے سے چار بچے نکلے جو محفوظ تھے لیکن اُن کا دَم گھٹنے لگا تھا۔ جب ان کی سانس بحال ہوئی تو وہ پھر سے اُس لاش سے لپٹ گئے کہ وہ ان کی پرنسپل کی

لاش تھی جوان چار بچوں کو بچانے کے لیے ان پر لیٹ گئی تھی۔

''یہ سب کچھ تیرے سامنے ہوا اور تو زندہ رہا۔''

''اے ناعاقبت اندیش تجھے میرے زندہ ہونے یا نہ ہونے کی پڑی ہے۔ دیکھتا نہیں کہ میں خون کے کس دریا کو عبور کر کے یہاں پہنچا ہوں۔''

''تو نے خون کا ایک دریا دیکھا ہے میں نے دریا کے پار بھی دریا دیکھا ہے۔'' تیسرے آدمی نے اب خاموشی توڑی۔

''پھر بھی تو زندہ رہا۔'' پہلے آدمی نے پوچھا۔

''ہاں مگر یہ نہ پوچھو کہ دوسرا دریا کیا تھا۔''

''دوسرا دریا کیا تھا۔'' اب دوسرے آدمی نے تیسرے آدمی سے پوچھا۔

''وہ پہاڑوں کے درمیان ایک گاؤں تھا۔''

''تو نے وہاں کیا دیکھا۔''

''میں نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگوں کو ڈھول بجا کر جمع کیا گیا اور جب سب گاؤں کے لوگ جمع ہو گئے تو چارپائیوں پر گاؤں کے بڑے بوڑھے، بزرگ، سیانے اور دیدہ ور روائتی پگڑیوں، کالی اور سفید داڑھیوں اور ڈھیلے لباسوں میں آ کر براجمان ہوئے۔ اُن میں سے ایک نے خاموش مجمع کی طرف دیکھا۔ مکمل سناٹا تھا۔ سرگوشی بھی گونج رہی تھی۔ ایسے میں وہ جو اُن سب میں زیادہ عمر کا بزرگ تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ پانچوں لڑکیوں کو پیش کیا جائے۔ اس حکم پر فوری عمل ہوا اور کچھ باریش لوگ رسیوں سے ہاتھ بندھی لڑکیوں کو لے کر حاضر ہوئے جن کا جسم اور چہرہ چادروں میں لپٹا ہوا تھا۔

بزرگ نے حکم جاری کیا کہ ان پانچ لڑکیوں نے گزشتہ رات اپنے ایک عزیز

کی شادی کی خوشی میں ناچ اور گانا گانے کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس پر انہیں پچاس پچاس کوڑوں کی سزا سنائی جاتی ہے اور اگر اس میں ان کا دم نکل جائے تو اسے عین انصاف تصور کیا جائے گا۔ اس کے بعد ان پانچ لڑکیوں کو زمین پر اوندھا لٹا دیا گیا اور سزا پر عمل ہوا۔ شروع میں ان کی چیخیں گونجیں پھر آہستہ آہستہ اُن کے جسم ٹھنڈے ہو گئے۔''

''اے آدم کی اولاد یہ دیکھ کر بھی تو زندہ رہا۔''

''صرف یہ بتانے کے لیے میں زندہ رہا۔''

''تو اب تو مر چکا ہے۔''

''ہاں میں مر چکا ہوں۔ مجھے تم دونوں مرا ہوا سمجھو۔''

یہ کہہ کر تیسرا آدمی خاموش ہو گیا۔

اس پر پہلے آدمی نے دوسرے آدمی سے کہا۔

''تو کیسے مرا۔ اب تیری باری ہے۔''

''میں ایسے مرا کہ یہ میرا دوسرا جنم تھا۔ اور میں نے آسمان کی طرف دیکھا ایک جہاز سے دھواں نکل رہا تھا اور وہ زمین کی طرف آ رہا تھا۔ پھر زور کا دھماکہ ہوا اور جہاز کہیں پہاڑی راستے میں گر گیا اور آگ کے شعلے آسمان تک پھیل رہے تھے۔ میں بھی کچھ اور لوگوں کے ہمراہ بھاگا۔ دشوار گزار راستوں سے گزر کر جب میں وہاں پہنچا تو آگ بجھائی جا رہی تھی۔ تو وہاں لوگ پہنچ گئے تھے۔ میں نے دیکھا۔''

''تو نے کیا دیکھا۔''

''میں نے دیکھا جلی ہوئی لاشوں کا سامان بہت بڑے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ جہاز گرنے کے فوراً بعد شاید آگ نہیں لگی گرنے کے بعد سامان ایسے بکھرا جیسا

قیامت کے روز زمین روئی کے گالوں کی طرح بکھر جائے گی۔ ایسے ہی وہاں ہوا۔"

"تو پھر تم نے کیا دیکھا۔"

"میں نے دیکھا کہ قریبی گاؤں کے لوگ لوٹ مار میں مصروف ہو گئے۔ ایک کے ہاتھ میں سونے کی چوڑیاں آ گئیں جو ایک بیوٹی بکس کے اندر سے نکل کر بکھر گئی تھیں۔ وہ یہ چوڑیاں لے کر بھاگ گیا۔ ایک جگہ، پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں سے بھرا تھیلا آدھا جل چکا تھا اُسے ایک آدمی نے اٹھایا اور چھوڑ دیا۔ پھر اُس نے ایک بیگ سے نکلے سامان کو ٹٹولا۔ اندر سے فیض احمد فیض کا "نسخہ ہائے وفا" کی کتاب نکلی۔ اُس نے جلدی سے اُسے بجھی آگ کی طرف پھینکا۔ پھر اُسے ایک اور کتاب ملی یہ سعادت حسن منٹو کے افسانوں کا مجموعہ تھا۔ اُس نے اُسے بھی آگ کی طرف پھینکا اور پھر دو قمیصیں، دو انڈرویئر اور شیونگ کا سامان لے کر بھاگ گیا۔"

"یہ سب دیکھ کر بھی تو زندہ رہا۔"

"یہ سب دیکھ کر تو مجھ میں زندہ رہنے کی اُمنگ پیدا ہوئی۔"

"تو پھر تو مرا کیسے۔"

"ہاں تم نے یاد دلایا کہ میں کیسے مرا تو میں ایسے مرا کہ میں نے دیکھا کہ آدھے جلے ہوئے پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کو ایک دیہاتی اسٹیٹ بینک کے دفتر لے کر آیا اور اُس نے دعویٰ کیا کہ یہ نوٹ اُس کے ہیں اور گھر میں آگ لگنے سے آدھے جل چکے ہیں اور اُن نوٹوں پر اُن کے نمبر موجود ہیں۔ اس پر ایک زیرک قسم کا بینک افسر آیا اور اُس نے پوچھا کہ تمہارا گھر کہاں ہے؟ اور اُسے آگ کیسے لگی اور اُس آگ لگنے کی اطلاع کہاں درج ہوئی۔

اس پر اُس نے کہا۔ یہ میرے ہیں کیونکہ میرے پاس ہیں اس پر بینک منیجر

نے انکم ٹیکس کے افسر کو بلا لیا۔

''تو کیا تو اس بات پر مر گیا۔''

''نہیں یہ بات نہیں تھی۔''

وہ ایک اور دن تھا۔ یسوع مسیح کو ایک بار پھر مصلوب کیا جانا تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ صبح کے مناجات میں بستی کے مرد، عورتیں، بچے سب اُس چرچ میں جمع تھے۔ بچے خاص طور پر ہر اتوار اس لکڑی کے ڈھانچے سے بنے ہوئے چرچ میں والدین کے ساتھ آتے تھے۔ اس لیے کہ اس روز صبح سویرے ہی چرچ کے باہر مختلف کھانے پینے اور کھلونوں کی ریڑیاں اور ٹھیلے لگ جاتے تھے۔ بس اسی شوق میں ہر اتوار صبح سویرے بچے بھی والدین کے ساتھ چپک جاتے تھے۔ مناجات جاری تھیں اور بچے سوچ رہے تھے کہ کب مناجات ختم ہوں اور وہ باہر آ کر دہی بھلے، گول گپے، قلفی، سموسے، رنگ برنگی مٹھائیاں اور کھلونے خرید سکیں۔ چرچ کے فادر نے یسوع مسیح کے فرمودات اور پیغام دہرائے اور بشارتوں کی نوید سنائی۔ چرچ کے ساتھ غریب بستی عام طور پر اتوار کی صبح خاموش اور خالی خالی ہوتی ہے۔ ایک ساتھ جڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکان اور دکانیں تعطیل کی وجہ سے روزمرہ کی آمدورفت سے محروم ہوتی ہیں۔ بستی کے چھوٹے بڑے چرچ میں سما جاتے اور جو گھروں پر رہ جاتے وہ یا تو معذور افراد ہوتے یا پھر کام کاج میں مصروف خواتین یا وہ نرسیں جو رات کی ڈیوٹی سے واپس آتی ہیں۔ چرچ کے باہر ٹھیلے اور ریڑی والے اکثر مسلمان ہوتے جو اِدھر اُدھر سے روزی کے لیے ہر اتوار اپنی مخصوص جگہ پر آ کے دیہاڑی لگاتے۔

عیسائیوں کی اس بستی سے ذرا فاصلے پر مسلمانوں کی چھوٹی بڑی آبادیاں بھی تھیں۔ بظاہر کسی قسم کا کوئی کھچاؤ یا کشیدگی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ زمانوں سے یہ غریب

لوگ ایک دوسرے کے ساتھ سکون سے رہ رہے تھے۔ اکثریت کے پیشے بھی ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ ابھی چرچ میں دعا جاری تھی کہ قریب کی ایک چھوٹی سی مسجد سے دو تین بار ایک اعلان کیا گیا۔ اعلان میں مقامی مولوی صاحب کا جوش بھی شامل تھا۔ وہ آبادی جو چند لمحے پہلے سکون اور آسودگی میں سانس لے رہی تھی۔ یکدم وہاں شور مچاتا ایک ہجوم ہاتھ میں پٹرول، مٹی کا تیل اور زبانوں سے نکلنے والے شعلوں کے ساتھ چرچ پر حملہ آور ہو گیا۔ چرچ میں آگ کے شعلوں اور دھوئیں سے قیامت برپا ہو گئی جو شعلوں سے بچے وہ دھوئیں میں دم گھٹنے سے دم توڑ گئے۔ مشکل سے چند لوگ باہر آ سکے اور جو باہر آئے وہ ہجوم کے غیظ و غضب کا نشانہ بن گئے۔ ہجوم یہاں سے فارغ ہوا تو گھروں پر حملہ آور ہو گیا۔ غریبوں کی بستی میں تھا کیا جو خاکستر ہوتا بس چند کپڑے، چار پائیاں اور برتن ہی تو رکھے تھے۔ مگر ان کے سروں سے چھت چھن چکی تھی۔''

''تو نے یہ سب دیکھا اور زندہ رہا۔''

''ہاں میں نے یہ سب دیکھا اور زندہ رہا۔''

''تو پھر تُو کب مرا۔''

''خاکستر بستی اور چرچ سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ ایسے میں ایک اور ہجوم وہاں آیا جو لوٹ مار کے لیے چرچ میں گھس گیا۔ ادھ جلی لاشوں کے کانوں سے بالیاں نوچنے لگا۔ ایک ادھ جلے ہاتھ سے چوڑیاں اُتاریں۔ فادر کے گلے سے اُس کی صلیب اُتار لی اور ایک بچے کی بند مٹھی کھولی تو اس میں سو روپے کا نوٹ تھا۔ اس کی مٹھی نہیں کھلی تو انگلیاں کاٹ کر سو روپے کا نوٹ نکال لیا۔ یہ ہجوم یہاں سے نکلا تو بستی کے جلے ہوئے گھروں میں لوٹ مار کے لیے حملہ کر دیا۔ ایک گھر کی تلاشی میں مصروف

ہوگیا۔ ایک گھر کے ایک اندھیرے کمرے میں دروازہ کھولا تو روشنی سی پڑی ایک کونے میں دبکی ایک لڑکی تھی جو گونگی تھی۔ وہ خوفزدہ ہوگئی اور چیخ تھرتھرا کر اندر ہی رہ گئی۔ وہ تین لوگ تھے۔ ایک نے کہا شلوار خود کھولوگی کہ ہم کھولیں۔ دوسرے نے کہا اوئے عیسائن ہے جھنگن ہے سانوں جائز اے اور پھر اس کے کپڑے انہوں نے نوچ کھسوٹ کے الگ کیے۔ ایک بولا اوئے یہ تو گونگی ہے۔ بول نہیں رہی بس آں آں کر رہی ہے۔ دوسرا بولا۔ یہ تو اور بھی اچھا ہے گواہی نہیں دے سکے گی اور پھر وہ باری باری.....

''بس یہ دیکھ کر تو مر گیا۔''

''ہاں میں نے سعادت حسن منٹو کے افسانے ''کھول دو'' کو یاد کیا اور میں مر گیا۔''

''تو دوستو اس حساب سے تو ہم تینوں مر چکے ہیں۔''

''ہاں مگر ایک سوال ہے کہ بٹوارے کے وقت کچھ ہوا تھا۔ یا جو مشرقی پاکستان میں ہوا تھا۔ یہ سب جو ہو رہا ہے یہ تو پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ سب تو کچھ اور ہے۔''

''ہاں یہ سب بھی اور ہے اور اس سب کو لکھنے کے لیے تو اور منٹو اور کچھ انتظار حسین بھی چاہئیں۔''

''کیا آج ان کے بغیر یہ سب وبال کون سہہ پائے گا۔ کیا یہ سب ان لکھی رزمیہ رہ جائے گی۔''

''صاحبو اگر ایک جگہ دھماکے میں سو سے زیادہ لوگ مارے جاتے ہیں تو ساتھ کی سڑک پر ٹریفک معمول کے مطابق چل رہی ہوتی ہے۔ ٹیلیویژن بریکنگ نیوز

چلانے کے بعد مزاحیہ اداکاروں کے حسبِ معمول کے مطابق چلانے لگتے ہیں۔ ایسے میں کسی منٹو یا انتظار حسین کی ضرورت کیسے محسوس ہوتی ہے۔''

''یہ بھی ایک کہی۔''

''مرنے کے بعد بھی کیا آدمی سوچ سکتا ہے۔''

''ہاں بھائی وہ اسی وقت ہی تو سوچنے کے قابل ہوتا ہے۔''

''تو پھر سوچنے کی ایک اور بات بھی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ جس ملک کو بنانے کے لیے لاکھوں انسان مارے گئے اُسے بچانے کے لیے اور کتنے لاکھوں انسانوں کی جان دینی ہوگی۔''

''اب یہ ہمارے سوچنے کی بات تو نہیں ہے کیونکہ ہم تو مر چکے ہیں۔''

''ہاں اب ہم اگلے جنم میں ملیں گے۔ اگر کوئی اگلے جنم میں زندہ باقی رہ گیا۔''

☆☆☆

شانتی.......شانتی سے ہے

شانتی بلبل اکیڈمی ڈھاکہ میں ڈانس سیکھ رہی تھیں۔ اُس وقت عمر صرف پندرہ سولہ سال میں تھی۔ ایک دن بنگالی ہدایت کار نے اُسے دیکھا اور پھر اُس کے والد کے پاس پہنچا اور اُس کی بیٹی کو بنگالی فلم میں کام کرنے کی دعوت دے دی۔ والد کی آنکھوں میں چمک آ ئی لیکن اُس نے ایک سوال ضرور کیا کہ فلم میں کہانی کیسی ہے اور اُس میں موسیقی اور رقص کو اہمیت حاصل ہے کہ نہیں۔ جب ہدایت کار نے یہ بتایا کہ فلم بنگال فوک کہانی پر ہے تو شانتی کے والد نے اُسے گلے لگا لیا کہ بنگالی فوک تو موسیقی اور رقص کا دوسرا نام ہے۔

شانتی نے مشرقی پاکستان میں اپنے فنی سفر کا آغاز کیا۔ بنگالی فلم اُس زمانے میں پچاس ہزار روپے میں مہنگی فلم کہلاتی تھی۔ عام فلم تو دس بارہ ہزار میں بن جاتی تھی۔ موسیقی تو ہر گھر میں گویا ایک بنیادی حق کی طرح سے رائج تھی۔ کوئی بھی گھر ہو اُس میں طبلہ، ہارمونیم اور ستار یا ان سے ملتے جلتے سستے ساز ضرور ہوا کرتے تھے۔ میں یعنی افسانہ نگار 1969ء میں پہلی بار کالج کی طرف سے اسلام آباد گیا تو میرے ایک ملنے والے نے مجھے شام کو بنگالی افسر کے گھر کھانے پر بلایا۔ یہ بنگالی افسر محکمہ تعلیم

میں ایڈیشنل سیکرٹری تھا۔ جب ہم اُس کے ڈرائنگ روم میں گئے تو وہاں طبلہ، ہارمونیم اور ستار رکھا تھا۔ ابتدائی باتوں کے بعد ایک لمحہ ایسا آیا کہ مکالمہ دم توڑ گیا تو اس نے اپنی بیٹی کو آواز دی کہ وہ آ کر بنگالی فوک سنائے۔ ایک بچی آئی اور اس نے ستار تھام لیا۔ باپ نے طبلہ اور ماں نے ہارمونیم۔ یہ تھا مغربی پاکستان کا اسلام آباد۔ پھر کیا ہوا؟ یہ تو تاریخ ہے۔ ایسے میں فردوسی بیگم کی وہ غزل جو اس نے ناصر کاظمی کی گائی تھی۔ اب یاد آ رہی ہے۔

ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا
دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

گویا ہم نے فردوسی بیگم کو اردو غزل کی گائیکی میں داخل کر لیا تھا۔ کہاں ہے فردوسی بیگم کہاں ہے ناصر کاظمی۔ جس نے لکھا تھا:

وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے
وہ گیت گانے والے کیا ہوئے

ہم کس بات پر بہت روئے۔ یہ ناصر کاظمی نے تو نہیں بتایا تھا۔ شاید ہم 16 دسمبر 1971ء کی شام کو بہت روئے جب ڈھاکہ یاد آیا۔

بات شانتی کی ہو رہی تھی تو شانتی نے بنگالی فلموں سے آغاز کیا اور ڈھاکہ میں اردو فلمیں بننا شروع ہو گئیں۔ اردو وہاں موجود تھی لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اردو زبان مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش میں تبدیل ہونے کا الزام برداشت کرے گی۔ یہ بات اپنی جگہ لیکن حیرت کی بات ہے کہ شانتی نے بنگالی سے اردو فلموں میں کام شروع کیا اُس کی فلموں نے مغربی پاکستان میں اتنا بڑا بزنس کیا کہ کسی بھی مغربی پاکستان کی فلم کو یہ بزنس نصیب نہ ہو سکا اور کل پینتالیس فلمیں اردو کی مشرقی پاکستان

میں بنیں اور ریلیز ہوئیں۔ شانتی کی تین فلمیں تو ایسی تھیں کہ جو دو سالوں تک ایک ہی سینما میں چلتی رہیں۔ اب نام بتانا کیا ضروری ہے۔ البتہ ایک بات بتانا ضروری ہے کہ اُس وقت سینما کے بورڈ وہ پینٹرز بناتے تھے جو خاندانی بزنس میں یہ کام سیکھ کر آتے تھے اور نرگس اور مدھو بالا کی ایسی تصویر کینوس پر بناتے تھے کہ لوگ کھڑے ہو کر دیکھتے ہوئے اپنی انگلیاں دانتوں میں داب لیتے تھے اور ایسے عاشق ہوتے تھے کہ فقیر بن جاتے تھے۔

تو ایسے میں شانتی کی فلموں کے بورڈ پہلی برسات میں ڈھل جاتے تھے اور دوسری برسات تک پینٹرز اُسے دوبارہ بناتے تھے۔ شانتی کے بورڈ ایک برسات بھی سہہ نہ سکتے تھے۔ لیکن جب فیض احمد فیض 1971ء کے بعد اپنے ڈھاکہ کے صحافیوں اور شاعروں سے ملنے گئے تو کسی نے فیض صاحب کو گھر پہ مدعو نہ کیا اور کچھ تو شہید ہو چکے تھے اور کچھ ملنے سے گریزاں تھے۔ اس لیے فیض احمد فیض نے نظم لکھی ''ڈھاکہ سے واپسی کے بعد''

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد

اس کے بعد فیض صاحب نے تاریخی مصرعہ لکھا:

ع خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

شانتی کی فلم کے پوسٹر تو ایک برسات میں ڈھل گئے مگر خون کے دھبے ایسے نہیں ڈھلتے۔ یہ بتایا فیض صاحب نے۔

ہم بات شانتی اداکارہ کی کر رہے تھے تو اُس نے مشرقی پاکستان کی فلموں میں کام کیا اور پھر کراچی آ گئیں جہاں انہیں مغربی پاکستان کی فلم میں کام مل گیا۔ اُن

کے خاوند جو موسیقار تھے کو بھی ساتھ آنا پڑا اور انہیں بھی فلم میں میوزک کا کام مل گیا۔
ان کا نام چیٹر جی تھا۔اب شانتی چیٹر جی ہو گئیں۔

شانتی مغربی پاکستان میں فلموں میں کام کرنے آ گئیں لیکن ایک بات کی انہیں سمجھ نہ آئی کہ مغربی پاکستان میں مشرقی پاکستان کی فلمیں تو ریلیز ہوتی ہیں جو اردو میں ہوتی ہیں۔ اُدھر مشرقی پاکستان میں بھی اردو کی فلمیں ریلیز ہوتی ہیں جو بنگالی فلمیں مشرقی پاکستان میں بنتی ہیں وہ مغربی پاکستان میں کیوں ریلیز نہیں ہوتیں۔ جب دونوں زبانیں پاکستانی ہیں تو پھر اُن فلموں کو جو بنگالی میں بن رہی تھیں مغربی پاکستان کا سرکٹ کیوں نہ ملا۔شانتی کو اس کا جواب نہ ملا۔ کسی نے کہا کہ بنگالی مغربی پاکستان میں کون سمجھے گا؟ تو اس کا شانتی نے جواب دیا کہ سینما کی اپنی زبان ہوتی ہے اور پھر انگریزی کون سی یہاں کی زبان ہے مگر انگریزی میں تو فلمیں یہاں ریلیز ہوتی ہیں۔

شانتی یہ سب سوچتی رہی اور اُس کی نگاہ میں فیض احمد فیض کی اکلوتی فلم ''جاگو ہوا سویرا'' تھی جو مشرقی پاکستان کے مچھیروں کی زندگی پر بنائی گئی تھی۔ یہ فلم ایک انقلاب کی آہٹ کا اعلان تھا۔لیکن فلم نہ چلی اور انقلاب کی دستک بھی وہیں رُک گئی۔

شانتی نے سولہ دسمبر 1971ء کو اپنے مغربی پاکستان کے گھر میں صبح کی تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس کا گھر تو اُس کے ملک میں نہیں رہا۔ وہ پاکستان کی شہری تھی۔ اب وہ ایک اور ملک کی شہری ہو چکی تھی۔اب ایسے میں کیا ہو سکتا تھا۔شانتی نے سوچا اُس کے فن کی کس کو ضرورت ہے۔اب اردو فلموں کا چیپٹر تو مشرقی پاکستان میں بند ہو گیا ہے۔اتنی مشکل سے اُس نے اردو سیکھی تو اب وہ کہاں جائے۔اُس کا اپنا ملک تو

اُس سے چھن چکا تھا اب تو وہ مغربی پاکستان میں اجنبی تھی جو اب پاکستان بن چکا تھا۔ قائداعظم، گاندھی، نہرو اور ماؤنٹ بیٹن نے تو یہ نہیں سوچا تھا کہ پاکستان کا آنے والا زمانہ کیا ہوگا۔ اب یہ کس کس کی غلطی تھی کہ ہندوستان کو بقول سعادت حسن منٹو ایک چاقو سے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا کہ کسی کو کچھ سمجھ نہ آئی۔

اور پھر امر جلیل نے دو سوال اٹھائے کہ یہ پاکستان کی آزادی نہیں تھی جسے 14 اگست کو ہم مناتے ہیں۔ آزاد وہ ہوتا ہے جو پہلے غلام ہو۔ جو ملک بنا نہ ہو وہ غلام کیسے ہوسکتا ہے۔ تو یہ پاکستان کی آزادی نہیں پاکستان کا قیام ہے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ قائداعظم نے پاکستان نہیں بنایا۔ پاکستان تو تاریخی حالات کے نتیجے میں بنایا گیا بلکہ وجود میں آیا۔ پاکستان کسی ایک فرد کی جدوجہد سے نہیں بنا۔ ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، عبدالغفار خان، ابوالکلام آزاد اور نادیدہ قوتوں کی کوشش سے قیام پذیر ہوا اور مہاتما گاندھی شکست کھا گئے اور ان کا نام اور تصویر ہندوستان کے کرنسی نوٹ پر رہ گیا۔

بات شانتی کی ہو رہی تھی تو شانتی پر یہ وقت گزرا کہ اُس کا گھر ڈھاکہ میں رہ گیا اور وہ لاہور میں رہ گئی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس کا خاوند اُس کے ساتھ تھا جو موسیقار تھا۔ ایک رات میں وہ دو ملکوں میں بٹ گئی تھی۔ ایسا 1947ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ساتھ ہوا تھا کہ ایک رات پہلے وہ ہندوستان کا شہری تھا اور اگلے دن وہ ہندوستان کے ایک ٹکڑے میں پڑا تھا اور اُسے معلوم نہیں تھا اسے کہاں بھیجا جائے گا۔

شانتی اور اس کے خاوند نے پاکستان میں رہنا قبول کیا لیکن ان کا خاندان اب بنگلہ دیش میں تھا۔ پھر جب اُدھر سے کہانیاں سامنے آنا شروع ہوئیں کہ کس طرح بنگالی عورتوں کی اجتماعی آبروریزی ہوئی اور کیسے پورے خاندان کے سامنے ان

عورتوں کو بے آبرو کیا گیا۔ دس بارہ سال کی بچی نے چارپائی کے نیچے پناہ لے رکھی تھی
اُسی چارپائی پر اس کی ماں اور بڑی بہن کو بے آبرو کیا گیا۔ مکافاتِ عمل ہی کہیں گے
کہ اُسی دس بارہ سال کی بچی کی گواہی پر ایک جماعت کے بڑے رہنما کو جس کی عمر ستر
سال سے اوپر تھی۔ بنگلہ دیشی عدالت نے پھانسی کی سزا دی اور عمل بھی کرایا۔ ٹھیک
چھتیس سال بعد شانتی کو بنگال کی عورتوں پر ہونے والے مظالم کی جب جب خبریں ملتی
رہیں تو اُسے محسوس ہوتا رہا کہ اُس کی اجتماعی آبروریزی ہوتی رہی ہے۔ آبروریزی
صرف جسمانی نہیں ہوتی۔ عورت پر ہونے والے اس ظلم کے نتیجے میں دنیا کی تمام
عورتیں بے لباس ہو جاتی ہیں اور ایسا لگتا ہے اُن کے ساتھ یہ اجتماعی بلادکار ہو رہا
ہے۔ شانتی نے محسوس کیا کہ وہ ایک دفعہ بنگال میں بے آبرو ہو چکی ہے۔ اکثر رات
کو خواب میں اس عمل کو دہراتے ہوئے وہ چیخ کر اُٹھ جاتی۔

شانتی پاکستانی فلموں کی مقبول ہیروئن تو پہلے دن ہی سے بن گئی تھی۔ اب وہ
واحد بڑی ہیروئن کے رُتبے پر آ چکی تھی۔ دن رات کالم اور اُس کے بنگالی حسن سے
اخبار اشتہار بھرے رہتے۔ اب وہ بنگالی عورتوں کے ساتھ ہونے والی اجتماعی
آبروریزی کو کچھ کچھ بھول گئی تھی۔ اب ایسا ہوا کہ پاکستان میں اور مارشل لا لگ گیا۔
یہ مارشل لا پہلے مارشل لاؤں کا بھی باپ تھا۔ ایک بڑے لیڈر کو جو وزیراعظم تھا پھانسی
دے دی گئی۔ ایک نظریے کے لوگ ملک بدر ہونے لگے۔ جو بچے وہ جیلوں میں ڈال
دیئے گئے۔ کچھ کو کوڑوں کی سزائیں ہونے لگیں۔ کچھ انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ مارشل لا کی
سمری عدالتیں پورے ملک میں پھیل گئیں جس سے فوری انصاف جاری ہونے لگا۔
ایسے میں شانتی کو معلوم نہیں تھا اُس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ دوسری مرتبہ
اجتماعی آبروریزی کا شکار ہونے والی تھی اور اب کے جو آبروریزی ہوئی تھی وہ محض

روحانی اور احساساتی نہیں تھی۔ یہ جسمانی روحانی اور انسانی ہر سطح پر تھی۔

ہوا یوں کہ مارشل لا میں سیاست سے لے کر ثقافت اور عوامی نمائندگی کی ہر بساط لپیٹ دی گئی تھی۔ ایسے میں دولت مندوں، رئیسوں، بڑے سرکاری افسروں اور نئے پیدا ہونے والے مذہبی مافیاؤں کے ساتھ ساتھ نو دولتیا کلاس نے خوب پر پرزے نکالے۔ ان کے لیے قانون دوسرا تھا۔ اس لیے کہ تھانوں سے لے کر عدالتوں تک ہر ادارہ فوجی عدالتوں کے ماتحت ہو چکا تھا۔ اس لیے بگڑے امیر زادوں، سرکاری افسروں کی بگڑتی ہوئی اولادوں نے خود کو ہر قانون سے ماورا سمجھنا شروع کر دیا۔ کوئی بھی معمولی فوجی افسر کسی بھی عزت دار کی پگڑی سڑک پر اتار دیتا۔ معاملہ دب جاتا۔ اگلے دن اخبار میں رپورٹ نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں ایک امیر کالج کے پانچ بڑے گھروں اور بڑی ذاتوں کے اصلی نسلی امیر زادوں نے ایک رات منصوبہ بندی کی کہ مشہور ہیروئن شانتی کے گھر داخل ہو کر اپنے جسم کو ٹھنڈا کیا جائے۔ ان امیر زادوں میں وہ بڑے خاندانوں کے چشم و چراغ بھی تھے جن کے خاندان کے کئی افراد بیورو کریٹ تھے۔ ان کو گمان تھا کہ اول تو وہ ہیروئن اس اجتماعی آبروریزی پر خاموشی اختیار کرے گی اور اپنی عزت کی ہانڈی بیچ چوراہے میں نہیں پھوڑے گی۔ دوسرا یہ کہ اُس زمانے کے میڈیا کو مارشل لا کا سانپ سونگھ گیا تھا۔ اُن امیر زادوں کا خیال تھا کہ اول تو شانتی بولے گی نہیں اور مکمل شانتی ہو جائے گی اور اگر اس نے بات کی تو میڈیا ویسے بھی فوجی افسران سے اجازت لے کر اخبار شائع کرتا ہے لہٰذا اس طرح کی خبر کو Kill کر دیا جائے گا۔ ٹیلیویژن سرکاری تھا اور وہاں بھی فوج کے لوگ ایک ایک مکالمے یا بیان کو سنسر کر کے نشر ہونے کی اجازت دیتے تھے۔ اس لیے یہ معاملہ اُٹھ بھی گیا تو جلدی اس پر مٹی ڈال دی جائے گی اور مارشل لا کو اپنے وقار کی خاطر یہ سب کرنا

ہی پڑے گا۔ سو انہوں نے واردات کی مکمل تیاری کر لی۔ اُچھلتا ہوا نیا خون تھا اور پھر خاندانی طاقت کا خمار بھی تھا۔ ساتھ میں کالج کی زندگی کا ایڈونچر ازم بھی اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ ان پانچ نوجوانوں نے جیپیں نکالیں اور روانہ ہوئے۔ جیسے نچلے طبقے کے غریب لڑکے خوشی کے ایام میں سلنسر نکال کر موٹر سائیکل چلاتے ہیں۔ ایسے ہی یہ امیرزادے جیپوں پر نکلے۔

لاہور کی قدرے امیر آبادی میں ایک کوٹھی کے پھاٹک کے سامنے رُکے۔ اُس زمانے میں موبائل فون کیا لینڈ لائن فون بھی اکثر گھروں میں نہیں ہوتے تھے۔ وہ ایسے خمار میں تھے کہ سیدھے اندر داخل ہو گئے۔ اُس کوٹھی پر کوئی گارڈ نہیں تھا۔ شانتی شوٹنگ سے آنے کے بعد اپنا لباس تبدیل کر رہی تھی کہ سامنے پانچ اجنبی نوجوان کھڑے ہو گئے اور ایک نے کہا "شہزادی لباس تو ہم بدلیں گے۔"

شانتی نے چیخ ماری مگر چیخ اس کی سانس میں کہیں گم ہو گئی۔ اُس کا بیٹا اُس وقت سات سال کا تھا۔ جو معلوم نہیں کتنا سمجھ سکتا تھا مگر وہ اُس دس بارہ سال کی بنگالی لڑکی کی طرح ماں کو بے آبرو ہوتے دیکھتا رہا جو ڈھاکہ کے ایک غریب گھر کی چارپائی کے نیچے چھپی سب کچھ دیکھ رہی تھی لیکن جب وہ عدالت میں آئی تو اس کی عمر پچاس سال کی ہو چکی تھی اور اس نے اس بوڑھے کو پہچانا جو اُس وقت ایک جماعت کی سٹوڈنٹ یونین کا سربراہ تھا اور اُس بوڑھے کو پھانسی ہو گئی۔ شانتی کو کمرے میں وہ پانچ پنجاب کے گھبرو لے کر گئے۔ اب وہاں افسانہ نگار کا کیمرہ جا نہیں سکتا تھا۔ سو اگلے دن کچھ بھی نہ ہوا۔

مگر شانتی دوسری دفعہ اجتماعی آبروریزی کا شکار ہو گئی۔ اب ایک سوال آتا ہے کہ جو عورت یا لڑکی دو مرتبہ اجتماعی آبروریزی کا شکار ہو جائے کیا وہ تیسری مرتبہ بھی

آبروریزی کا شکار ہوسکتی ہے؟ بس یہی اس افسانے میں ہونا ہے۔ قاری کو تیار رہنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ یہ Interactive کا زمانہ ہے۔ یعنی تخلیق کار کا رابطہ اُس کے قاری یا اگر تھیٹر دیکھنے والے سے ہے تو میں بتائے دیتا ہوں کہ وہ اوباش امیرزادے معلوم نہیں کس قسم کا ایڈونچرازم کر کے جیپوں میں بیٹھ کر بھاگ گئے اور شانتی جو کسی فضول سی فلم کا شاٹ دے کر گھر میں آئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پاکستانی فلم کا ہدایتکار جو روزانہ اُس کے ساتھ بلادکار سکرین پر کرتا ہے۔ اُس کی شہہ لے کر چند امیرزادے اُس کی اجتماعی آبروریزی کریں گے۔ بہر حال یہ ہوا۔

اگلے دن کے اخبارات خاموش تھے۔ اس لیے کہ یہ آج کا زمانہ نہیں تھا کہ بریکنگ نیوز چلتی۔ واقعہ ہوگیا سو ہوگیا۔ لیکن ایک صحافی جو مارشل لا کے بھی قریب تھا اور سول سوسائٹی کے بھی قریب تھا اُس نے مارشل لا کے مالک کو یہ خبر دے دی اور مارشل لا کے مالک نے اُسے کہا کہ اس خبر کو فوراً قومی میڈیا پر ہوا دے دی جائے۔ چنانچہ اس خبر نے پرواز کی۔ اگلے دن پاکستان کی عوام حیران رہ گئی کہ شانتی کی آبروریزی کی خبریں آسمان پر چڑھ دوڑیں۔

پاکستانی عوام کے پاس تو سوچنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ اس خبر نے ہر طرح کے عوام کے طبقوں میں کئی طرح کے اثرات ڈالے۔ مثلاً ایک طبقہ جو عادی فلم بینوں اور تماش بینوں کا ہوتا ہے اُس نے کفِ افسوس ملا کہ موقع واردات پر وہ خود کیوں نہیں تھا۔ بہتی ہوئی گنگا نہیں تو بہتی ہوئی پدما میں ہاتھ دھو لیتے۔ ''پدما میرے بہو۔''

اسی طرح ایک طبقہ وہ بھی تھا جو اس منظر کو آنکھوں میں رچائے لذت لے لے کر واقعہ نگاری کو حقیقت نگاری سمجھتے ہوئے اخباری میدان میں کود پڑا۔ وہ طبقے بھی تھے جو مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد ہندوستان سے انتقام کا موقع

تلاش کر رہے تھے جو ان کی دانست میں انہیں مل گیا تھا۔ ایسے طبقے بھی تھے جو اپنے آپ سے شرمندہ تھے کہ وہ دوسری بار بنگالی عورتوں کو اجتماعی آبروریزی سے نہ بچا سکے۔

غرض خاموش جھیل میں جیسے کسی نے کنکر ڈال دیا ہو۔ ملکی حالات کی بے حسی اور خاموشی میں اس ایک واقعے نے وہی کام کیا جو مارشل لا کے حاکم نے پپو کے قاتلوں کو سرعام چوک میں پھانسیاں دے کر کیا تھا اور خوب داد سمیٹی تھی۔ اور جس دن یہ واقعہ ہوا لاہور امڈ آیا تھا تماشہ دیکھنے کے لیے اور وہی چھلے، پکوڑے، پھورے، گول گپے اور قلفیاں بیچنے والوں کی چاندی ہوگئی تھی۔ ایسا گاہک تو انہیں داتا صاحب کے عرس یا میلہ چراغاں میں بھی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ بہرحال اب مارشل لا کے حاکم کے لیے انصاف کے بول بالا کا ایک اور موقع آ چکا تھا۔ چنانچہ فوری انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے پنجاب کے پانچ بڑے خانوادوں کے پانچ چشم و چراغ جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچ گئے۔ فوجی حکمرانوں نے انصاف کے نام پر پوری قوم پر ایسی دہشت بٹھائی کہ پانچوں با اثر اور کلاسیکل خاندانوں کے وڈیرے اور اونچے شملے والے طرم خان سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اُن کے نزدیک سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ انگریزوں نے انہیں یہاں کا حکمران طبقہ بنایا۔ انگریزوں نے دربار میں سامنے کی کرسی دی۔ زمینیں الاٹ کیں، سو کوس تک ان کے گھوڑوں کی چاپ گونجتی تھی۔ گھوڑوں کے سموں سے دھرتی کانپ جاتی تھی اور آج پلک جھپکتے میں انہیں مارشل لا کے حاکم نے کمی کمین بنا دیا ہے۔ اُن کے لاڈلوں نے ایسا کیا کفر تول دیا ہے۔ ایک فلمی ہیروئن جو کہ شادی شدہ بھی تھی اور پھر وہ کون سی ستی ساوتری ہوگی یا باحیا قسم کی باپردہ گھریلو عورت تھی۔ آخر پرائے مردوں کے ساتھ کھلے عام رقص کرتی تھی۔ بانہوں

میں بلکہ گلے میں بانہیں ڈال کے جھپیاں لیتی تھی۔ کیا خبر فلمی ہیروؤں کے ساتھ کیا کچھ نہ کرتی ہوگی۔ ہمارے کنوارے لڑکوں نے کون سا انوکھا جرم کر دیا ہے۔ فلمی ہیروئنوں کا کس کو پتہ نہیں کہ وہ کیسے فلموں میں آتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اُن پانچ بڑے خانوادوں کے بڑوں کو یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ان کے ہاں تو رعایا کی جو لڑکی جوانی کی پہلی سیڑھی چڑھتی ہے سیدھی اُن کے لاڈلوں کے بیڈ روم میں پہنچتی ہے۔ یہ جوان ہوتے ہوئے لڑکے تو اپنی نیٹ پریکٹس رعایا کی بیٹیوں پہ آزماتے ہیں۔ ایسی کون سی بڑی بات ہوگئی جس پر اس قسم کا مقدمہ چلایا جائے۔ ''کس برتے پہ تتا پانی۔'' بہر حال ان خاندانوں کے سربراہوں نے اپنے اثرورسوخ کو استعمال کرنا شروع کیا۔ فوج میں بھی اوپر تک پہنچ رکھتے تھے اور پھر بیوروکریسی میں تو وہ خود اور ان کے رشتہ دار شامل تھے۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر ایک جواب ملا کہ حکومت کو اپنی ساکھ بنانے کا نادر موقع ملا ہے اس لیے وہ اس سے فائدہ اٹھائے بغیر نہیں مل سکتی۔

چنانچہ سمری ملٹری کورٹ کو نہ تو کسی ثبوت کی ضرورت تھی نہ ہی انہیں خوانخواہ کیس کو لٹکانے کی کوئی ضرورت تھی۔ اشارہ واضح تھا کہ ان پانچوں کو عبرت کا نشان بنا دیا جائے۔ دو تین سماعتوں کے بعد پانچوں نوجوانوں کو پھانسی کی سزائیں سنا دی گئیں۔ ملک میں ایک بار پھر سناٹا طاری ہوگیا اور لوگوں میں چہ میگوئیاں پھیل گئیں کہ ہو نہ ہو فوج عوام کی حفاظت کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے اور یہ پھانسیاں بھی کسی مشہور شاہراہ پر سرعام دی جائیں گی۔ اب تو ایک طرح کی سراسیمگی پھیل گئی۔ بلکہ ان نوجوانوں سے ہمدردی کے جذبات بھی پیدا ہونے لگے اور معافی تلافی کی صورتیں تلاش کی جانے لگیں۔ کچھ نے مشورہ دیا کہ شانتی کے پاس جا کر ان لڑکوں کی زندگی کی بھیک مانگی جائے۔ کچھ نے کہا بھاری جائیداد کی پیشکش کی جائے۔ لیکن شانتی تو گھر پر

نہیں تھیں انہیں تو حکومت نے حفاظتی پناہ میں رکھا ہوا تھا۔

جوں جوں پھانسیوں کی تاریخ قریب آتی گئی، اضطراب بڑھتا گیا۔ اب ان خانوادوں نے جب اوپر تک رابطے کیے تو معلوم ہوا کہ صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ معافی کے لیے بھاری تاوان جو اُس زمانے میں کروڑوں اور اربوں میں ہوگا کا بندوبست کیا جائے۔ چاروں خاندانوں نے یہ تاوان ادا کرنے کی تیاری شروع کر دی۔

شانتی کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ اس کی اجتماعی آبروریزی اب تیسری بار ہونے والی تھی۔ دو بار اجتماعی آبروریزی تو سمجھ میں آتی ہے یہ تیسری بار کس طرح کی اجتماعی آبروریزی ہو سکتی ہے لیکن لگتا یہی تھا کہ شانتی کو تیسری بار بھی اجتماعی زیادتی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پہلی بار تو بنگلہ دیش میں بنگالی عورتوں کے ساتھ یہ واردات ہوئی تھی جسے شانتی نے پاکستان میں محسوس کیا تھا گویا یہ واردات اس کے ساتھ ہوئی ہے اور دوسری مرتبہ وہ سچ مچ اس کا نشانہ بنی۔ مگر اب تیسری بار..... یہ البتہ حیرت کی بات تھی مگر ایسا ہونے والا تھا۔

شانتی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ انصاف کے نام پر اُس کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی ایک تیاری ہو رہی ہے۔ پانچوں خاندانوں نے اپنے اپنے نوجوانوں کی جان بخشی کے لیے ہر طرح کا تاوان ادا کرنے کا انتظام کر لیا اور اب راوی جو کچھ لکھتا ہے اُس پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ مارشل لا کا حاکم کیفرِ کردار تک پہنچ چکا ہے۔ کون بتائے کہ اُس ایک رات میں کیا ہوا؟ شانتی کو اُس رات تیسری مرتبہ اجتماعی زیادتی کا سامنا کرنا پڑا۔ معلوم نہیں وہ سات لوگ تھے یا دس لوگ تھے جنہوں نے اس اجتماعی زیادتی میں حصہ لیا۔ وہ لوگ نہیں تھے۔ وہ مارشل لا کے حاکم کے ناک کے بال

تھے۔ راوی ڈرتا ہے وہ جانتا ہے وہ کون لوگ تھے۔ وہ کتنے بڑے عہدوں پر فائز تھے اور مارشل لا کا حاکم انہیں راتوں رات کروڑ پتی بنانا چاہتا تھا۔ اُن سے کیا کام لینا چاہتا تھا۔ راوی خاموش ہے۔

ہوا یوں کہ پھانسی کا دن قریب آ چکا تھا۔ قاعدے کے مطابق ان پانچوں خاندانوں کے پاس کچھ بوٹوں والے پہنچے ایک درخواست رکھی جو صدرِ پاکستان کے نام رحم کی اپیل تھی۔ سب نے دستخط کیے اور طے شدہ رقم یا طے شدہ تاوان ادا کر دیا۔ وہ افراد جن کے ناموں اور عہدوں پر تاریخ کی گرد جم چکی ہے۔ وہ رحم کی اپیل اور اس کی قیمت لے کر روانہ ہو گئے۔

اُسی شام اُن میں سے کچھ بوٹوں والے شانتی کے پاس پہنچے اور حاکم وقت کا پیغام دیا کہ ان گمراہ لڑکوں کو شانتی اپنی طرف سے معاف کر دے تا کہ رحم کی اپیل کی منظوری کا کریڈٹ حاکم وقت کو جانے کے بجائے شانتی کو جائے ویسے بھی فنکار حساس ہوتے ہیں تو پانچ جوانوں کی موت سے شانتی کو کیا فائدہ ہوگا۔ اس طرح عوام کو اچھا پیغام جائے گا اور شانتی کی عزت میں اضافہ ہوگا۔ شانتی ساری بات سمجھ چکی تھی کہ یہ سارا ڈراما اس رات تک پہنچنے کے لیے رچایا گیا تھا۔ مگر اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اُسے اسی ملک میں ابھی کام بھی کرنا تھا تو ان بوٹ والوں سے بگاڑ کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس کے پاس اُس رات میں اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ انہیں معاف کر دیتی۔ اُس نے معاف کر دیا۔ اگلے دن کے اخبارات میں خبر آ گئی کہ شانتی کو انصاف مل گیا ہے۔ شانتی کی انسان دوستی کو سراہا گیا۔ بڑے بڑے اخبار نویسوں کو بھی آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ اُس رات کیا ہوا تھا؟ شانتی تیسری بار اجتماعی زیادتی کا نشانہ بن چکی تھی اور کچھ لوگ کروڑ پتی بن چکے تھے۔ جن کو حکومت نے جان بوجھ کر یہ

نامنک دیا تھا۔ راوی تاریخ سے گرد اٹھانے سے گریزاں ہے۔ اس لیے اُس رات کیا ہوا تھا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ یہ تو اچانک کہانی مجھے ایک بساطی کی دکان کے کونے میں چھپی ہوئی مل گئی تو اُس نے بتایا کہ شانتی کے ساتھ کیا ہوا۔ کہانی اکثر مجھے خواب میں بھی آتی ہے اور بہت کچھ بتا رہی ہے۔ اس واقعے کے بعد شانتی پاکستان سے اپنا فنی سفر مکمل کر کے ڈھاکہ روانہ ہو گئی اور ہمارے قومی اور اجتماعی حافظے سے ساری واردات صاف ہو گئی۔

اب بیس پچیس سال بعد جب شانتی کراچی کی ایک تقریب میں بلاوے پر آئی تو لاہور بھی آ گئیں۔ دوستوں نے اور اداروں نے انہیں بہت عزت دی۔ دن رات تقریبات میں آؤ بھگت جاری رہی۔ دو جگہ مجھے شانتی سے مکالمہ کرنے کا موقع ملا تو محسوس کیا کہ اس کے ذہن میں وہ واقعہ ابھی تک ایک ڈراؤنے خواب کی طرح موجود ہے۔ جب میں نے پاکستان چھوڑنے کی بات کی تو اس نے بظاہر بتایا کہ اس کے والد کو ڈھاکہ میں فالج کا حملہ ہوا تو میری بہن نے مجھے فون کیا۔ اُس نے بتایا کچھ نہیں بس یہی بولی کہ جلدی آ جاؤ۔ بابا تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ بنگلہ دیش میں گئیں تو بنگلہ دیش والوں نے نہیں پوچھا تم کہاں رہ گئی تھیں۔ باپ کا ذکر کر کے آنکھوں سے آنسو آ گئے۔ کہانی کہیں پاس ہی تھی۔ کہنے لگی یہ آنسو کوئی اور کہانی بتا رہے ہیں۔ شانتی کو بہت کچھ یاد آ رہا ہے۔ کہانی تو جیسے میرے اندر کہیں چھپ جاتی تھی۔ سو غائب ہو گئی۔ میں نے گاڑی میں شانتی کو ہوٹل چھوڑنا تھا۔ وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ میں نے کہا تمہیں لاہور میں اپنا گھر یاد ہے۔ کیا وہ نہیں دیکھو گی۔ تو اُس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے اُس رات کے پانچ نوجوانوں میں سے ایک میں بھی تھا۔ اس نے مجھے ٹٹولا کہ کہیں ان میں سے تو نہیں تھا۔

چند لمحوں بعد ہوٹل آ گیا۔ وہ اترنے لگی تو اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے گھر کھانے پر بلایا تو کہنے لگی ہاں آؤں گی آپ پامفرٹ مچھلی مجھے کھلائیں گے یا دال بھات۔ میں نے وعدہ کیا اور بس اتنا پوچھا۔ شانتی کیا تم خوش ہو۔ کہنے لگیں خوشی کا تو پتہ نہیں۔ ہاں شانتی سے ہوں۔ یہ کہہ کر وہ ہوٹل کی لابی میں گم ہو گئی۔

☆☆☆

لندن 2050ء

کہانی مجھے ملی تو یہ 2010ء کی ایک خوبصورت شام تھی۔ احمد صہبائی نے مجھے فون کیا کہ اوئے لچے ملتانی آج شام میرے گھر پہنچنا ہے۔ تمہیں اپنی بیگم سے ملوانا ہے جو تھیسز میں پی ایچ ڈی کر رہی ہے اور ہاں پئیں گے، کھائیں گے اور شاہ حسین کی کافی بھی سنیں گے۔

احمد صہبائی شروع دن سے مجھے لچا ملتانی صرف اس لیے کہتا آیا ہے کہ اُس کے لچے پن کو میں کہیں پبلک میں ظاہر نہ کردوں۔ اس خوبصورت شام سے پہلے ذرا احمد صہبائی کا تعارف کرادوں۔ احمد صہبائی کا والد بھی شاعر تھا اور کلاسیکل شاعری میں نام پیدا کیا۔ مگر یہ تعارف تو بے حد معمولی ہے۔ احمد صہبائی گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ایم۔اے کرنے گیا تو اُس نے استادوں کو دیوارسے اور لڑکیوں کو سینے سے لگا لیا۔ بلا کا خوبصورت اور بدن کی خوشبو ایسی رسیلی کہ سوکوس سے لڑکیاں اُس کی خوشبو کی سیدھ میں آکر داسی بن جاتی تھیں۔ گورنمنٹ کالج میں بہت ناٹک کیے۔ ایک کرسچین لڑکی سے عشق کیا۔ اُس نے بھی اُس سے کئی گنا زیادہ عشق کیا۔ بات محض کرسچین کی نہیں ہو رہی صرف اُس لڑکی کی ہو رہی ہے جس نے اپنا مذہب بھی ایک

طرف رکھا اور دیوانی ہو گئی۔ احمد صہبائی کو لڑکیوں کو دیوانہ بنانے کا قدرتی ملکہ حاصل تھا۔ اُسے کچھ بھی نہیں کرنا ہوتا تھا بس اُسے انگریزی، اردو اور پنجابی میں بات کرنے کا ایسا سلیقہ آتا تھا کہ دنیا دم سادھے اس کی بات سنتی تھی۔ اُسے پتہ تھا کہ کب انگریزی کا جادو جگانا ہے۔ کب پنجابی کی جوت جگانی ہے اور کب اردو کا تڑکا لگانا ہے۔ وہ جہاں ہوتا وہ محفل بس اُس کی ہوتی۔

مجھے کہانی نے ٹوکا کہ تم احمد صہبائی کا خاکہ نہیں لکھ رہے صرف اُس کردار کو متعارف کرا رہے ہو۔ میں نے کہانی کا مطلب سمجھ لیا تو پھر باقی بات یوں ہے کہ احمد صہبائی ڈراما نگار، شاعر اور ہدایتکار کا فن اپنی پیدائش کے ساتھ ہی لے کر آیا تھا۔ اُس نے تھیٹر میں تجربے کیے، اُس نے شاعری میں تجربے کیے۔ اب میرا احمد صہبائی سے کیا تعلق بنا۔ یہ بھی بتانا ضروری ہے۔ میں ملتان کا ایک بے نامی باپ کا بیٹا جس کے باپ نے اپنے مریدوں کو اپنا گرویدہ بنایا مگر خود ایک سائیکل پر رہا۔ سفید کپڑوں کے علاوہ اُسے کوئی لباس پسند نہ تھا اور آخری عمر میں شہر کے سارے امیر زادے، کارپوریٹ کے ماہرین اُن کے حلقۂ ارادت میں آ چکے تھے۔ لیکن احمد صہبائی نے مجھے پہچانا جب میری نظمیں کراچی کے سبطِ حسن صاحب کے پرچے میں شائع ہوئیں۔ کہانی ناراض ہو جائے گی کہ یہ اضافی بات ہے۔ احمد صہبائی نے پاکستان ٹیلیویژن میں اعلیٰ عہدے پر ملازمت اختیار کر لی۔ اُس سے پہلے اُس نے چائے بیچی وہ بھی سیالکوٹ میں جا کر یہ بھی اضافی بات ہے۔

تو پھر یہ ہوا کہ پی ٹی وی میں احمد صہبائی نے مجھے ملتان سے بلا کر پروگراموں میں شامل کیا۔ ملتان میں اُس وقت ٹی وی کی نشریات ہی نہیں تھیں یا نئی نئی دیکھی جا رہی تھیں۔ میں نے احمد صہبائی کے گھر ٹھہرنا شروع کر دیا۔ ایک صبح

احمد صہبائی نے میرے کان میں کہا۔ ناشتے کی میز سے اٹھتے ہوئے تم نے مجھ سے بات کرتے ہوئے کہنا ہے کہ احمد صہبائی ہماری میٹنگ مجلس ترقی ادب میں ہے۔

میں نے یہی کہا وہ جو احمد صہبائی کی بیگم تھیں وہ میرا منہ دیکھ کر خاموش ہو گئیں کہ میرا منہ بہت پکا تھا اور پھر اُس خاتون نے میرے کہے کو سچ جانا یا نہیں مگر میری عزت رکھ لی اور ایک ٹفن احمد صہبائی کے حوالے کیا جس میں دوپہر کا کھانا تھا۔ احمد صہبائی سڑک کے کنارے ایک موٹل میں اتر گیا جہاں پی ٹی وی کی انتہائی حسین عورت اُس کے لیے موجود تھی۔ اب پھر کہانی نے مجھے ٹوکا کہ تم نے اتنا لمبا فلیش بیک چلا دیا۔ سو ہم اُس شام پر آتے ہیں جب احمد صہبائی نے مجھے سرپرائز دیا۔

ایک انگریز لڑکی جو اردو بھی تھوڑی بہت بول رہی تھی۔ پاکستان میں فوک تھیٹر کی روایت پر پی ایچ ڈی کرنے آئی۔ میگی مارٹن جب اس سلسلے میں احمد صہبائی سے ملی تو احمد صہبائی اپنے بچوں سے تقریباً فارغ ہو چکا تھا۔ پہلی بیوی اُسے چھوڑ کر برطانیہ شفٹ ہو چکی تھی۔ اُس شادی کے بعد بھی کچھ نکاحوں کی اطلاعات تھیں۔ بہر حال میگی کا احمد صہبائی کے دائرے میں آ کر نکلنا تو مشکل سی بات تھی۔ سو شادی ہو گئی اور پی ایچ ڈی کے مکمل ہوتے ہی ایک گورا بچہ گود میں آ گیا۔ اس کا دیسی نام سانول رکھا گیا جو انگریزی میں سین ول بن سکتا تھا اور احمد صہبائی چونکہ گوری رنگت رکھتا ہے تو سانول بھی مکمل گورا پیدا ہوا۔ اُسے نہیں پتہ تھا ایک دن اُس کی یہ ولدیت اُس کے کس طرح کام آئے گی۔ ایسے تو کئی بچے برطانیہ میں پل بڑھ رہے تھے۔ جوانی سے بزرگی کی طرف بڑھ رہے تھے جن کی مائیں گوری اور باپ دیسی تھے لیکن سانول کو ماں اور باپ کی طرف سے جہیز میں علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کا نادر ملاپ نصیب ہو رہا تھا جو کسی اور کو حاصل ہونا مشکل تھا جس کا باپ دیسی اور ماں گوری ہو۔

اس دوران لندن میں کئی تجزیے نکلنے شروع ہوئے جو 2017 تک باقاعدہ سچ ثابت ہونے لگے۔ پہلا تجزیہ یہ سامنے آیا کہ انگریزوں کی شادیاں فلاپ ہونے لگیں تو پورے یورپ کی طرح شادی کا ادارہ کمزور پڑنے لگا۔ گورے دوستیوں کو شادی میں تبدیل کرنے سے گریز کرنے لگے۔ جب تک دل چاہا کسی کے ساتھ رہے جب چاہا راستہ بدل لیا۔ بچے پیدا کرنے سے پرہیز کرنے لگے۔ آبادی میں مقامی گوروں کا حصہ کم سے کم ہونے لگا۔ یورپ میں تو شرح پیدائش منفی میں چلی گئی۔ اب برطانیہ میں بھی یہ رجحان آ گیا۔ اس کی تجزیہ نگاروں نے کئی وجوہات بتائیں جس میں برطانیہ کی اکانومی میں تارکین وطن کا حصہ افزائش کے رجحان پر آ گیا۔ مقامی گوروں نے کاروبار کرنے کو اپنی توہین جانا۔ تارکین وطن نے چھوٹے کاموں سے بڑے بزنس کی طرف رجوع کیا۔ مقامی گوروں نے آباؤاجداد کی جاگیروں اور بڑے بڑے محلات اور کاسلز کو اپنے لیے بوجھ سمجھ کر فروخت کرنا شروع کر دیا۔ بالکل ایسے جیسے ملتان کے جاگیرداروں کی ایکڑوں میں پھیلی حویلیاں ایک ایک کر کے انڈیا سے آئے مہاجروں کے بزنس پر چھا جانے کے بعد بکنے لگیں اور وہاں شاپنگ سنٹر اور میگا پروجیکٹس کھڑے ہو گئے جو ضیاالحق کے دور کے بعد نو دولتیے مافیاؤں نے کالے دھن سے خریدنا شروع کر دیے۔ اس طبقے کو Filthy Rich کا نام دیا گیا۔ وہی سیاست پر چھا گئے اور ملکی دولت پاکستان سے باہر جانے لگی۔ خاص طور پر یورپ اور برطانیہ کے بینکوں اور ریئل سٹیٹ کے بزنس میں اُن کا سکہ چلنا شروع ہونے لگا۔

برطانیہ میں اس تجزیے کے مطابق لندن کا سنٹرل علاقہ عربوں، پاکستانیوں، انڈینز اور باقی قوموں نے خرید لیا جن میں ترکی، بنگلہ دیش، چین، جاپانی اور روس کے ملکوں کے لوگ شامل تھے۔ اس تجزیے کے بعد ایک تجزیہ سامنے آیا کہ

اگلے بیس سالوں میں مسلمانوں کی آبادی اتنی بڑھے گی کہ وہ دنیا میں مذہبی حوالے سے پہلے نمبر پر آجائیں گے۔

لاہور میں ایک سیمینار میں لندن سے آئے ہوئے ایک پرچون فروش اور شراب فروش نے فخریہ اعلان کیا کہ اگلے تیس سالوں میں برطانیہ میں مسلمانوں کی آبادی دگنی ہو جائے گی۔ ایک ستم ظریف جو کہ افسانہ نگار بھی تھا نے کھڑے ہو کر درخواست کی کہ جناب اگر آپ ڈبل شفٹ میں کام کریں تو یہ ٹارگٹ پندرہ سالوں میں بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک اور تجزیہ زیادہ خوفناک تھا۔ وہ یورپی اور بالخصوص برطانیہ کی نامی گرامی یونیورسٹیوں کے حوالے سے تھا جو دنیا کی پہلی سو یونیورسٹیوں میں آتی ہیں اور ان یونیورسٹیوں کو اپنا مقام اور نمبر برقرار رکھنے کے لیے سخت جدوجہد کا سامنا اس لیے تھا کہ امریکہ، آسٹریلیا، کینیڈا، جرمنی، جاپان، چین اور سنٹرل یورپ کے ملکوں کی یونیورسٹیاں آگے بڑھنے لگی تھیں اور اُس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جو ممالک دوسری جنگ عظیم کے بعد مختلف یورپی ممالک یا امریکی تسلط سے آزاد ہوئے تھے وہاں جمہوریت کے بجائے مطلق العنان حکمرانوں نے جمہوریت کے لبادے میں اور نام نہاد قومی قربانیوں کے لبادے میں اپنی Dynasties کو پروان چڑھایا وہاں چونکہ تعلیم کی کمی تھی انہوں نے اس میں اور کمی پیدا کر کے رعایا کو غلام بنا لیا تھا اور ایک حکمران طبقہ اپنے گماشتوں کے ساتھ لوٹ مار کر کے سفید کالر کرائم میں ملوث ہو گیا۔ جمہوریت کا لبادہ انہوں نے مقامی میڈیا، صحافیوں، کالم نویسوں اور سوشل ایلیٹ کو ساتھ ملا کر پہنا تھا۔ جس کے نتیجے میں ان کے کارندے بھی نوازے گئے۔ کارندے اسٹیبلشمنٹ اور بیوروکریسی سے تعلق رکھتے ہیں جو اس طبقے کے سامنے وہی کردار ادا کرتے ہیں جو انڈیا میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سامنے راجوں اور مہاراجوں نے ادا کیا

تھا۔ تاریخ کیسے خودکو دہراتی ہے یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا لیکن ایسا تو ہوتا ہے۔ بات یونیورسٹیوں کی ہو رہی تھی تو ہوائیوں کہ ان ملکوں کے اُس طبقے نے جو ملکی دولت لوٹی تھی وہ ان سے سنبھالی نہ گئی۔ بینکوں میں ڈالی رقم تو ایسے تھی جیسے گھر کے فریزر میں گوشت۔ اب گوشت جب تازہ آ رہا ہو تو فریزر کے گوشت کی کس کو ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ ان ملکوں کی دولت نے برطانیہ اور یورپ میں کہرام مچا دیا۔ وہاں کی یونیورسٹیوں کو اپنا معیار اور اپنا مقام بچانے کے لیے دولت کی ضرورت تھی۔ اس لیے انہوں نے ہر طرح کے داخلے کی فیسیں وقت کے حساب سے متعین کیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں ان کے مقامی باشندوں کو داخلہ لینا مشکل ہو گیا۔ جب معاملہ مارکیٹ اکانومی کا ہو تو باپ بیٹے کا لحاظ نہیں کرتا چنانچہ برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں مقامی برطانوی طلبہ کم سے کم ہوتے گئے اور ان یونیورسٹیوں نے دنیا میں پر پھیلائے تاکہ یونیورسٹی چلانے کے لیے دولت آئے تو نتیجہ یہ نکلا کہ ان یونیورسٹیوں نے مقامی برطانوی طلبہ کو کوئی رعایت نہ دی اور ان یونیورسٹیوں میں انڈیا، پاکستان، چین، عرب ورلڈ، روس، سکینڈے نیویا، لاطینی امریکہ، ملائیشیا اور اس طرح کے ملکوں کے امیر طلبہ نے اپنا مقام بنا لیا۔ یہ طلبہ ذہین بھی تھے کہ ان ملکوں نے غلامی کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ اب نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی برطانوی باشندوں کی تعلیم بھی ادھوری رہ گئی اور اُن کا بزنس سے بھی ناتا نہ رہا۔ یہ تجزیے 2017ء کے آس پاس تھے۔ اب کہانی نے مجھے ٹوکا کہ 2050ء میں جانا ہے۔ اتنا انتظار نہیں کر سکتی۔ میں نے کہانی کو چند لمحوں کے لیے روکا کہ جانِ من، کچھ باتیں قاری کو بتانا ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ روس کے زوال کے بعد سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے اندر سے کارپوریٹ سیکٹر کا بچہ پیدا کیا۔ وہ بچہ بھوت بن کر چھا گیا۔ ایسے میں کارپوریٹ سیکٹر نے اپنے پر پھیلائے۔ جس میں

لٹریری فیسٹیول کا کلچر بھی تھا تا کہ انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے ان فیسٹیولز میں سرمایہ لگایا جائے۔ انڈیا کے ایک بے حد بڑے سرمایہ دار نے اُردو کو اپنا ذریعہ بنانے کے لیے انڈیا اور پاکستان کے بڑے لکھنے والوں کو بڑی بڑی دعوتوں میں بلایا اور اُردو کی جگہ اُردو کے اولین نام ریختہ کو استعمال کیا تا کہ اردو پر جو مسلمانوں کی زبان کا الزام تھا وہ ایک طرف ہو جائے اور ایک گنگا جمنی نام ریختہ کی چھتری میں وہ اپنا کام کر جائیں۔ چنانچہ یہ بھی ہوا اور انہوں نے ٹھیک ٹھاک انکم ٹیکس بچایا۔ انہوں نے گوپی چند نارنگ، گلزار، شمیم حنفی، شمس الرحمن فاروقی، جاوید اختر اور کچھ پاکستانی شاعروں کو بھی استعمال کیا اور بی جے پی کی حکومت میں بھی سرخرو ٹھہرے اگلے چند سالوں میں آپ سنیں گے کہ وہ پارلیمنٹ کے ممبر ہو چکے ہیں۔ کارپوریٹ سیکٹر نے ٹرمپ اور مودی کو جتوایا اب پاکستان میں آگے وہ کس کو لاتے ہیں یہ سوال بے حد اہم ہے۔ مگر کہانی نے پھر ٹوکا کہ آگے بڑھو۔ کہانی بہت آگے تمہیں ملے گی۔

تجزیے بتانے لگے کہ 2050ء کا لندن کیسا ہوگا۔ مسلمانوں کی آبادی کے ساتھ ایشیائی اور غربت میں پھنسے چھوٹے بڑے ملکوں کی آبادی میں اضافہ کا اثر لندن پر پڑنے کے امکان روشن ہونے لگے اور برطانیہ میں مقامی برطانوی آبادی کم سے کم ہونے لگی۔ آبادی کے توازن کے بگڑنے سے اور عالمی سطح پر مسلمانوں میں فرقہ بندی اور مذہبی شدت پسندی کی شکلیں اختیار کرتے ہوئے برطانیہ کا معاشرہ یکسر بدل گیا۔ اور 2050ء تک پہنچتے پہنچتے تاریخ نے خود کو دہرانا شروع کر دیا۔ اب گوروں کے مورخین کا ماتھا ٹھنکا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی جس طرح کلکتہ کے راستے پورے انڈیا پر قابض ہوئی تھی، اب پتہ چلا کہ برصغیر سے جو لوگ روزی کی تلاش میں آئے تھے انہوں نے برصغیر پر قبضے کا بدلہ 2050ء کے آس پاس لے لیا ہے۔ اُدھر سکاٹ لینڈ

کے رہنے والے کسانوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی میں بھرتی کر کے برطانیہ نے جس طرح استعمال کیا تھا۔ اب ان سکاٹش لوگوں کو مسلمانوں کی مقامی آبادی گوروں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ہوا یوں کہ سکاٹ لوگ تعلیم میں پیچھے رہ چکے تھے اور بزنس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ سکاٹش اُن کی ملازمت میں آ گئے اور گوروں کے خلاف استعمال ہونے لگے۔ یہ 2050 کی روشن شام تھی جب لندن کے ایک بہت مشہور پب میں معمول کے مطابق رش تھا سکھ، ہندو، مسلمان، عیسائی، غیر ملکی اور گورے بہت گرما گرم بحث میں الجھے ہوئے کہ جو الیکشن ہوئے ہیں اُس نے پورے لندن اور برطانیہ میں کشیدگی پیدا کر دی ہے اور یہ نہیں معلوم کہ آئندہ کا وزیر اعظم کون ہوگا۔ گورے کم تعداد میں تھے اور بے حد خوفزدہ تھے۔ بڑے بڑے دعوے ہندو سکھ اور مسلمان کر رہے تھے۔ عجیب وغریب فضا میں الیکشن ہوئے تھے کہ بنگلہ دیشی اور پاکستانی مسلمانوں کی کثیر تعداد اس الیکشن میں کامیاب ہوئی تھی۔ گوروں کی سیٹیں کم تھیں وہ بھی لندن کے مضافات اور ان کاؤنٹیز اور شہروں میں سے تھیں جہاں گورے لندن سے بھاگ کر آباد ہو گئے تھے۔ لندن کی فضا ایک عرصے سے مختلف مسائل کا شکار ہو چکی تھی۔ مثلاً لندن کے سکولوں اور کالجوں میں اسلامی نصاب رائج ہو چکا تھا۔ بعض جگہوں پر حجاب اور پردہ لازمی قرار دیا جا چکا تھا۔ لندن میں ہر طرف عربی، پاکستانی اور بنگلہ دیشی لباس کے فیشن ڈیزائنرز کثیر تعداد میں اپنے برانڈ لے کر آ چکے تھے۔ جن میں سب سے زیادہ بکنے والا برانڈ جنید جمشید، شاہد آفریدی اور انضمام الحق کا تھا۔ مولانا طارق جمیل کی کیسٹیں جگہ جگہ بک رہی تھیں۔ مساجد پر قبضوں نے ایک نیا تنازعہ کھڑا کر دیا تھا۔ لندن کی قیمتی جگہوں پر مختلف فرقوں نے اپنی اپنی مساجد کے لیے جلسے جلوس نکال کے قیمتی کمرشل جگہوں پر ایک یا دو تین اینٹوں کی

مساجد بنائی تھیں۔ ان مساجد کے ساتھ دکانیں بھی قائم ہوگئی تھیں اور کمیونٹی سنٹرز جو سو سالوں سے قائم تھے وہ سب مختلف مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے اپنے نام کرا لیے تھے۔ کمال کا ماحول تھا۔ بعض سنٹرز میں صبح صبح بھجن کی محفلیں سجتی تھیں۔ ''اوم جگدیش ہرے۔ سوامی راما جگدیش ہرے'' ساتھ کے کمیونٹی سنٹر میں سکھوں کا پاٹھ جاری ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ملحق مسجد سے مولانا اسماعیل وزیرآبادی کا درس چل رہا ہوتا تھا جس میں وہ فرما رہے ہوتے تھے'' کیا زمانہ آگیا ہے کہ بے راہ روی کے نئے طریقوں نے امت مسلمہ کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہے۔ گوروں کے دیس میں لہوولعب کی رسومات نے ہم مسلمانوں کے ایمان پر حملہ کر دیا ہے۔ لندن ہمارا گھر ہے۔ ہمارا وطن ہے اسے ہم ہر طرح کی غیر اسلامی حرکات سے بچائیں گے۔ سوشل میڈیا تو کل کی بات تھی اب تو انسان کے جسم میں فیس بک، ریس بک اور ہر طرح کی ٹیکنالوجی کی چپ لگ چکی ہے۔ ہر آدمی ہر بچہ ہر بچی اُس چپ کی وجہ سے پوری دنیا سے جڑ چکا ہے اور جب بھی اُن کی مرضی کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو اندر کی بتی جل جاتی ہے اور واقعہ اُن کے Gadget پر آ جاتا ہے۔ اخبار جو چھپتے تھے وہ کب سے بند ہو چکے ہیں۔ ٹی وی چینلز ایک ایک کر کے بند ہو چکے ہیں۔ پورا ملک ٹی وی چینل بن چکا ہے اور دنیا بڑے بڑے کمرشل زونز میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ ایسے میں ہم مذہبی رہنماؤں کا فرض ہے کہ ہم اُمت کی رہنمائی کرتے ہوئے لندن کے مسلمانوں کو بتائیں کہ آئندہ کا وزیراعظم مسلمان ہونا چاہیے نہیں تو ہم برطانیہ کی نئی حکومت کو قبول نہیں کریں گے اور ہم ایسا احتجاج کریں گے کہ ایفل ٹاور سے لے کر برج الخلیفہ تک پھیل جائے گا۔''

''الحمد للہ۔ ہم مسلمان ایران، عراق، پاکستان، انڈیا کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے حب اہل بیت کے فریضے کو انجام دیتے ہوئے شہدائے کربلا کی

قربانیوں کو آج 2050ء تک اپنے مسلمانوں تک لے آئے ہیں۔ وہ جو بھی ایک شاعر نے کہا تھا "اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد" تو مسلمانوں کے سامنے کتنی کربلائیں آئیں پھر بھی اسلام قائم رہا اور رہے گا۔ ایک شاعر تھا جوش ملیح آبادی اُس نے کہا تھا

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؓ

تو اب ہر قوم پکار رہی ہے کہ حسینؓ ہمارے ہیں۔ اس پر لندن کے امام باڑے میں مجلسِ عزا برپا ہو رہی تھی۔

اُدھر عیسائیوں نے بھی اپنے چرچ میں موسیقی کی جوت جگا رکھی تھی۔ ایسے میں لندن صحیح معنوں میں ایک ایسا معاشرہ بن چکا تھا جو پوری دنیا کے مذاہب کا مرکز کہلا رہا تھا۔

بات ایک پب سے شروع ہوئی تھی۔ جہاں سانول صہبائی بیٹھا شراب پی کر برطانیہ کے مستقبل پر بات کر رہا تھا۔ اُس کو لوگ سین ول صہبائی کے نام سے جانتے تھے اور اپنے گورے علاقے کا الیکشن جیت چکا تھا۔ اُس کی والدہ جس نے پنجاب کے فوک تھیمز پر پی ایچ ڈی کیا تھا وہ اب اولڈ ایج ہوم میں پہنچ چکی تھی۔ دس پندرہ دن بعد سانول اُسے دیکھنے جاتا تھا۔

اب اُس پب میں سانول صہبائی، جس کو لوگ Sanwal sebai بولتے تھے سب کی نگاہوں کا مرکز تھا کہ وہ ایک انگریز علاقے سے جو اُس کی ماں کا آبائی علاقہ تھا، منتخب ہو چکا تھا مگر صوفی قسم کا تھا اور اُسے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صوفی میوزک اور صوفی شاعروں کو اپنے والد احمد صہبائی کی ابتدائی تربیت ہی میں

گھول کے پی چکا تھا۔ اس لیے وہ ہر مذہب کا نہ صرف احترام کرتا تھا بلکہ ہر مذہب کی تقریبات میں ایسے شریک ہوتا تھا جیسے وہ ان میں سے ہو۔ ہولی دیوالی پر ہندوؤں کے لباس میں شریک ہو کر موج مستی کرتا۔ سکھوں کے گردواروں میں بھی دیکھا جاتا تھا اور عیسائیوں کی مذہبی رسومات بشمول کرسمس میں تو وہ اپنی ماں کی وجہ سے بھی بھرپور حصہ لیتا تھا۔ وہ پب میں بیٹھا خاموشی سے نئی بننے والی حکومت سے متعلق طرح طرح کے تجزیوں کو سن رہا تھا۔ ساتھ میں پب کی سرگرم زندگی اور ایک بھرپور شام کا لطف بھی اٹھا رہا تھا۔ نئی حکومت سے متعلق کئی نظریات گردش کر رہے تھے کہ اگر ہندو اور سکھ ممبر مسلمانوں کا ساتھ دے دیں تو آنے والا وزیراعظم مسلمان ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر گوروں نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائی تو سب کے لیے یہ ایک مشکل مرحلہ ہوگا۔ خبریں یہ بھی آ رہی تھیں کہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد نہیں ہو پا رہا۔ کیونکہ لندن میں ایک چھوٹا پاکستان الگ علاقے میں بن چکا تھا۔ بھارتی تارکین وطن نے اپنا علاقہ الگ بنا لیا تھا اور ایسٹ لندن میں چھوٹا بنگلہ دیش وجود میں آ چکا تھا۔ گویا ایک برصغیر لندن 2050ء میں موجود تھا۔

لندن کے صدیوں پرانے اور تاریخی پب کچھ عرصے سے دھمکیوں کی زد میں تھے۔ جو پب مسلمانوں کے علاقوں میں آ گئے چاہے وہ بنگلہ دیشیوں کے علاقے تھے یا پاکستانیوں اور عربوں کے علاقے تھے۔ پہلے تو انہیں دھمکیاں موصول ہوئیں کہ اپنا بوریا بستر لپیٹ کے لے جائیں نہیں تو شراب سے گلیاں صاف کر دی جائیں گی۔ پھر پب میں بیٹھنے والوں پر چھوٹے بڑے حملے ہونے لگے۔ یہاں تک کہ کچھ پبوں کو لوٹ بھی لیا گیا۔ اس صورت حال سے پولیس بھی نہیں نمٹ سکتی تھی۔ پولیس میں بھی داڑھیوں والے مسلمان آ چکے تھے۔ وہ ایسے موقع پر خاموش تماشائی بن کر شرابیوں

کو حفاظت سے نکال لے جاتی۔ ایک ایک کر کے مسلمان علاقوں سے پب رخصت ہو گئے۔ مسلمانوں کی اکثر دکانوں میں آف لائسنس شراب کے کاؤنٹر موجود تھے۔ جب پاکستان اور بنگلہ دیش اور بھارت سے بھی مسلمان یہاں آ کر آباد ہونا شروع ہوئے تو انہوں نے مختلف علاقوں میں گروسری کی دکانیں کھول لیں تھیں۔ جن میں سبزی، پھل، آٹا، دالیں، دودھ، ڈبل روٹی غرض گھر کی ضرورت کی سب اشیاء موجود ہوتی تھیں۔ ساتھ میں شراب بیچنے کا پرمٹ بھی ہوتا تھا۔ کچھ مسلمانوں نے تو شراب ہی کی دکانیں اور ایسے ریسٹورنٹ بنائے جہاں کھانے کے ساتھ شراب بھی پیش کی جاتی تھی۔ اس کاروبار میں مسلمانوں نے اتنا مال بنایا کہ فوڈ چینز قائم کر لیں۔ بڑے بڑے ویئر ہاؤس بنا لیے۔ یہاں تک کہ حلال کے نام پہ ہر طرح کا گوشت اور پولٹری کے بزنس پر چھا گئے۔

جب نامی گرامی بھارتی، بنگلہ دیشی اور پاکستانی علما اور مولانا حضرات نے لندن اور یورپ کو اپنا مرکز بنایا تو یہاں کا ماحول تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔ شرعی لباس، عمامے، حجاب، مصلے اور دیگر ضروریات زندگی کا کاروبار بھی عروج پر آ گیا۔ ان مولانا صاحبان کا نزلہ پہلے تو لباس پر گرا پھر شراب کو انہوں نے اپنا خاص موضوع بنالیا۔ چونکہ عریانی اور فحاشی ظاہری طور پر قابو میں آ چکی تھی اس لیے شراب ان کا لذیذ اور محبوب موضوع بن گیا تھا۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں کی دکانوں سے شراب کی فروخت ختم ہونے لگی۔ ریسٹورنٹس میں بھی شراب کی جگہ لسی، پیپا کولا ڈا، جوسز اور سکنجبین نے لے لی۔

اور اب پب اُن کے نشانے پر تھے۔ اُس شام سینول صبائی (سانول صہبائی) پب میں بیٹھا لندن کے مستقبل پر تبصرے سن رہا تھا۔ یہ بہت کلاسیکی اور قدیم

پب تھا جس کی بڑی عظیم تاریخ چرچل کی وجہ سے تھی۔ چرچل یہاں بیٹھتا تھا۔ مشہور رائٹرز، موسیقار اور فنکار یہاں بیٹھتے تھے۔ ان سب کی تصویریں بھی وہاں لگی ہوئی تھیں۔ چرچل برٹرینڈ رسل، ٹی ایس ایلیٹ، سر لارنس اولیور، سر چرڈ چیمبر لین اور اس طرح کی عظیم شخصیات کی تصویریں آویزاں تھیں۔ پب کو نوادرات سے ایسے سجایا گیا تھا کہ لندن کی پوری تاریخ اس میں سمٹ آئی تھی۔ ابھی شام عروج پر آئی تھی کہ باریش مسلمانوں کے ایک گروہ نے ڈنڈوں اور گندے انڈوں سے حملہ کر دیا۔ کسی کو کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا ہورہا ہے۔ حملہ آور اسلام کا نام استعمال کر رہے تھے اور شراب کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ جتنی دیر میں پولیس آئی انہوں نے میزیں الٹ پلٹ دیں، بوتلیں اور گلاس توڑ دیے، کچھ تاریخی نوادرات اور تصویروں کو بھی نقصان پہنچایا۔ چرچل اور برٹرینڈ رسل کی تصویر نیچے گری ہوئی تھیں ان کے شیشے ڈنڈوں سے توڑ دیے گئے تھے۔ سین ول صبائی نے اردو میں ان کو ٹوکا کہ اسلام تو رواداری کا دین ہے۔ دوسروں کے معاملات میں دخل دینے کا حکم نہیں دیتا۔ پولیس کے سائرن سنتے ہی بازو کی گلیوں سے حملہ آور بھاگ گئے۔ لندن کی تنگ گلیاں اس طرح کے حملوں میں حملہ آوروں کا بہت ساتھ دیتی ہیں۔

یہ سب کچھ دیکھ کر سین ول صبائی کو محسوس ہوا وہ پاکستان میں چلا گیا ہے۔ اُسے لندن اور برطانیہ کا مستقبل خطرے میں محسوس ہوا۔ اُسے اپنے بابا احمد صہبائی اور دادا کی روحیں بے چین ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سین ول صبائی نے اپنا جام ادھورا چھوڑا اور خاموشی سے اُٹھ گیا۔

شہر میں کچھ دنوں سے کشیدگی کی خبریں آنے لگی تھیں۔ جوں جوں حکومت بنانے کے لیے جوڑ توڑ بڑھ رہا تھا۔ بنگلہ دیش، انڈین اور پاکستانی علاقوں میں اپنی اپنی

سٹریٹ پاور کو منوانے کے لیے پہلے تو چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی تھیں، جو بڑھتے بڑھتے لوٹ مار اور آتش زنی میں تبدیل ہونے لگیں۔ اس پر لندن پولیس نے دو تین علاقوں میں کرفیو لگا دیا۔ حکومت بنانے کے لیے تاخیر ہونے لگی اس لیے کہ لندن میں ایک برصغیر تین حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ پاکستانی مسلمانوں نے پہلے مرحلے پر بھارتی مسلمانوں سے ایک ہونے کی درخواست کی کہ مسلمان صدیوں سے مل کر رہتے آ رہے تھے۔ بھارتی مسلمانوں کے لیڈر صغیر احمد صدیقی نے پاکستانی مسلمانوں کے لیڈر چوہدری فرزند علی المعروف کھاریاں والے کو بہت سخت جواب دیا کہ 1947ء میں تم لوگ ہمیں ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ کے چلے گئے تھے۔ اُس وقت تمہارے جناح کو قائداعظم بننے کی جلدی تھی۔ وہ اگر متحدہ ہندوستان میں رہتے تو پھر بھی قائداعظم کا ٹائٹل انہی کے حصے میں آتا۔ ابوالکلام آزاد اور علمائے ہند نے آپ کے جناح صاحب کی مخالفت کی تھی۔ اُس وقت تو آپ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اب ہم بھارتی مسلمان ہیں۔ یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے۔ اب پاکستانی کمیونٹی نے ایک کوشش بنگلہ دیشی مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے وفد بھیجا۔ بنگلہ دیشی لیڈر جلیل اللہ نے 1971ء کی جنگ کا پرانا حساب کھول کے سامنے رکھ دیا کہ پاکستانی فوج نے اُن پر کس طرح چڑھائی کی۔ ان کے لاکھوں لوگ مارے گئے۔ پھر ایک بہاری نے بھی پاکستان پر الزام لگایا کہ بہاریوں کو پاکستان لے جا کر آباد کرنے کا وعدہ پاکستان نے پورا نہ کیا۔ جس سے ان کی چار نسلیں تباہ و برباد ہو گئیں۔

پاکستانی وفد کے سربراہ نے معافی تلافی کی باتیں کیں اور اُس وقت کی پاکستانی لیڈر شپ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ بنگلہ دیشی لیڈر نے پرانے زخموں کو بھلانے سے انکار کرتے ہوئے فیض احمد فیض کی نظم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ؏ خون کے

دھبے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد۔ پاکستانی وفد واپس چلا گیا۔ اُدھر برطانوی پارلیمنٹ کی تشکیل کے لیے گورے ممبروں نے بھی تعاون کے لیے ہندو بھارتیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بھارتی ہندو ممبران کی تعداد کم تھی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ بنگالی ممبروں اور بھارت سے تعلق رکھنے والے مسلمان ممبروں کو اکٹھا کیا جائے جس سے پاکستانی مسلمان ممبران کو تنہا کر کے اپوزیشن میں بیٹھنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ گورے ممبران بہت تجربہ کار اور ہمارے حاکم رہنے کی وجہ سے احساسِ برتری رکھتے تھے وہ تمام امکانات پر غور کرنے لگے۔ ساتھ ہی وہ اپنے بزرگوں کی غلطیوں پر چار حرف بھیجنے لگے جنہوں نے برصغیر کے لوگوں کو روزگار کے لیے یہ راستہ دکھایا۔ بالکل ایسے جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں قدم رکھا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ تاریخ اُن کا حساب چکانا چاہتی ہے۔ چونکہ الیکشن ختم ہو چکے تھے اس لیے بنگلہ دیشی، پاکستانی اور انڈین اپنے اپنے علاقوں میں محصور ہو چکے تھے۔ لندن کا سنٹرل حصہ پہلے جیسی رونق اور سیاحوں کی چہل پہل سے محروم ہو چکا تھا۔ عربوں نے اپنے علاقوں میں مکمل عربی کلچر اور عرب دنیا کی بادشاہت کا پورا ثبوت دنیا کے سامنے رکھ دیا تھا۔ سعودی عرب کی اشرافیہ اور متمول طبقہ اپنی عیاشی کے سارے طور طریقے بشمول بیلے ڈانس اور گوشت خوری کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے حرم رکھنے کی عادات کو پورا کر رہا تھا۔ جا بجا عطریات کی دکانیں، خواتین کے لیے جدید برانڈ کی پوشاکیں، لحم حلال سے بھرے ہوئے ریستوران۔ غرض ان کے علاقے سے کسی اور قوم کے فرد کا گزرنا مشکل ہو چکا تھا۔ قریب میں ایرانی محلّہ بھی تھا۔ جو ناک پر رومال رکھ کے قریب سے گزرتے تھے۔ ان کے اپنے ریستوران اور اپنے قہوہ خانے تھے۔ سنٹرل لندن کے اطراف میں اسرائیلی، لبنانی، ترکش، یونانی اور چینی آبادیاں بھی تھیں لیکن ان کا حصہ برطانیہ کی

سیاست میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ سکاٹ لینڈ میں جو پاکستانی مسلمان آباد تھے ان میں شیعہ خاندانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لیے وہاں محرم کا مہینہ لکھنؤ کے محرم جیسا ہوا کرتا تھا۔

اب کہانی نے مجھے پھر ٹوکا کہ مطلب کی بات کرو۔ میں نے کہانی کو سمجھایا کہ بی بی قاری کو ذرا اپنے ساتھ شریک تو کرنے دو۔ کہانی بولی تم اپنے مرکزی کردار سین ول صہبائی کو بھول رہے ہو۔ ہاں تو میں سین ول صہبائی کی گورے ممبروں میں حیثیت کو نہیں بھولنا چاہتا کہ وہ گورے ممبروں میں بہت دانش منداور اعلیٰ تعلیم یافتہ تو تھا ہی وہ ثقافتی تنوع کا پرچارک بھی تھا۔ اس لیے اُس کو گورے وقت پر استعمال کرنے کے لیے ترپ کا پتا سمجھتے تھے۔ سین ول صہبائی برطانیہ کو انتہا پسندی اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو قابو میں لانے کے لئے اپنا کردار ادا کرنا چاہتا تھا۔ اُس کے پاس صرف صوفیا کا پیغام اور اپنے باپ احمد صہبائی کی دی ہوئی لوک دانش تھی۔ وہ سوچنے لگا جیسے ایک زمانے میں صوفیا نے برصغیر کے تمام مذاہب کو آپس میں ایک دوسرے کے احترام کے لیے آمادہ کیا تھا اور ہندوستان کی تقسیم تک تمام مذاہب کے لوگ مل جل کر رہنا سیکھ گئے تھے کہ پھر اچانک ہندوستان تقسیم ہو گیا اور پھر نفرتوں کے بیج تناور درخت بنتے چلے گئے اور صوفیا کا پیغام کہیں گنبدوں میں گم ہو گیا۔ سین ول صہبائی کو ایسے محسوس ہوا جیسے برصغیر کے لوگ پھر سے اس پیغام کی تلاش میں ہیں اور ایک منی برصغیر لندن میں موجود ہے جسے پھر سے جوڑا جا سکتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے دوسری جنگ عظیم کے بعد لندن میں تین اُس وقت کے روشن دماغ لوگ مل کر بیٹھے کہ یہ یورپی اقوام نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا کیا ہے۔ فکر وفلسفہ اور ادب وسائنس نے یہاں کی قوموں کو کچھ نہیں سکھایا کہ اس طرح کی تباہی نے پورے یورپ کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ

تین روشن دماغ فوراً سین ول صبائی کے دھیان میں آئے جو 1949ء میں ایک جگہ ملے اور ایک قرارداد پر دستخط کیے۔ یہ تین نابغہ روزگار لوگ چرچل، برٹرینڈ رسل اور آئن سٹائن تھے۔ جنہوں نے یورپی اقوام کو یہ پیغام دیا کہ ہم نے بہت جنگیں لڑ کے دیکھ لی ہیں کیوں نہ ہم ہزاروں سال پہلے کی فطری زندگی میں واپس چلے جائیں اور سرحدوں کے ساتھ اپنی اپنی قومیتوں کے بت بھی گرادیں۔ مل کر جینا سیکھیں۔

سین ول صبائی نے یاد کیا کہ اُس وقت ان کی بات کا کسی نے نوٹس نہ لیا لیکن پھر یورپ کی اقوام نے اس قرارداد پر عمل کر کے سرحدیں مٹادیں۔ ویزہ ختم کردیا اور یورپی یونین بن گئی۔ اب سین ول یہ چاہتا تھا کہ صوفیا کے پیغام کی طاقت سے اس منی برصغیر کو پھر سے جوڑا جائے جو تین ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا اور ایک متحدہ ہندوستان دوبارہ گورے کی مدد سے بنادیا جائے۔ دنیا کو اچھا پیغام جائے گا۔ بٹوارے میں جو کچھ کھویا تھا وہ اب اس اتحاد کی صورت میں واپس کیا جائے۔ سین ول نے گورے ممبران کی مدد سے اس ایجنڈے پر غور کرنا شروع کردیا۔ اُدھر جس طرح 1947ء کے آس پاس برصغیر کے مسلمانوں میں دو رویے اور دو آرا پیدا ہوگئی تھیں لندن میں بھی مسلمان پاکستانیوں میں اس جیت کے بعد دو طرح کے گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ ایک وہ تھے جو ہر حال میں ویسٹ منسٹر پر اپنا جھنڈا گاڑنا چاہتے تھے۔ دوسرے وہ تھے جو لندن میں مل جل کے آپس میں امن و شانتی سے رہنے کے حق میں تھے۔ اب جو جذباتی گروہ تھا وہ ہندوؤں اور سکھوں کی دکانوں پر حملہ آور ہو جاتا تھا۔ جواب میں ہندو اور سکھ بھی داؤ لگنے پر مسلمانوں کی دکانیں لوٹ لیتے تھے۔ گویا 1947ء کا ماحول 2050ء کے لندن میں پیدا ہو چکا تھا۔ سین ول تاریخ کا طالب علم بھی تھا۔ اس نے یہ ذمہ داری محسوس کی کہ اگر تاریخ خود کو دہرا رہی ہے تو اس کا کوئی مثبت عمل ہونا چاہیے۔

اُس نے مسلمان لیڈر جو پاکستان کی طرف سے تھا چوہدری فرزند علی المعروف کھاریاں والے اور انڈین مسلم لیڈر صغیر احمد صدیقی کو کھانے پر دعوت دی اور دونوں کو تاریخ سے آگاہ کیا اور ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھیانک فسادات کا حوالہ دے کر سعادت حسن منٹو کے افسانوں کو بھی یاد کیا اور دونوں کو یورپ کی تاریخی غلطیوں سے بھی آگاہ کیا۔ انڈین مسلم لیڈر نے ابوالکلام آزاد اور خان عبدالغفار خان کے ساتھ مولانا مودودی اور دیگر علما کے حوالے دے کر پاکستان کے مسلم لیڈر چوہدری فرزند علی المعروف کھاریاں والے کو چاروں شانے چت کر دیا کہ چوہدری صاحب صرف آلو چاول اور آٹے دال کا بھاؤ جانتے تھے پورے یورپ میں ان کی فوڈ چینز چل رہی تھیں۔ سین ول نے سمجھایا کہ لندن اگر بلووں کی زد میں آ گیا تو جیسے ایک زمانے میں طاعون نے لندن اُجاڑ دیا تھا ایسے ہی اب بھی ہوگا۔ تو کیا تم اپنی آنے والی نسلوں کو تباہ کرنا چاہتے ہو۔ اس پر چوہدری فرزند علی المعروف کھاریاں والے کا ماتھا ٹھنکا کیونکہ وہ کاروباری آدمی تھا اور اُس کا سرمایہ پورے یورپ میں بکھرا ہوا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس سیاسی رسہ کشی میں سب سے زیادہ نقصان اُس کا ہوگا لیکن اُسے پاکستانی مولانا حضرات اور جذباتی پاکستانیوں کے اُس رویے کا علم بھی تھا جو دلی پر تو جھنڈا گاڑ نہ سکے اب ویسٹ منسٹر پر جھنڈا گاڑنا چاہتے تھے اس لیے اُس نے ایسا فارمولا پیش کر دیا جس میں امن کے لیے کچھ گنجائش موجود تھی۔ چوہدری صاحب نے کہا کہ ایک گول میز کانفرنس بلائی جائے جس میں برطانیہ کی ساری مذہبی اور قومی پارٹیاں موجود ہوں اور پھر کوئی فیصلہ کیا جائے۔ سین ول نے اس پر اتفاق کیا اور اجلاس برخاست ہو گیا۔

اب سین ول (سانول صہبائی) نے گورے ممبروں میں سے کچھ ممبروں کا وفد تشکیل دیا اور اُن سے کہا کہ پہلے بنگلہ دیشی ممبروں سے ملاقات کریں اور اُن کو کچھ

اچھی وزارتوں کی آفر کے ساتھ ذرا ئیں کہ اگر انڈین ممبرز پاکستانی ممبروں کے ساتھ مل کر حکومت بنالیں گے تو وہ شودروں کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائیں گے اس لیے وہ برطانوی گورے ممبروں کے ساتھ مل جائیں۔ یہ سب ہیک ڈور ڈپلومیسی میں ہو رہا تھا جس کا ماہر انگریز ہمیشہ سے رہا تھا۔ بنگلہ دیشیوں نے گول میز کانفرنس میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی اور سوچ بچار میں مصروف ہو گئے۔

اس دوران ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ تینوں ملکوں کے تارکین وطن نے اشتعال انگیزی سے ہاتھ کھینچ لیا لیکن فضا اور ماحول کشیدہ رہا۔ اب انگریز ممبروں نے بھارتی ہندو ممبروں سے مشاورت کی اور انہیں گاندھی کے فلسفے سے روشناس کیا اور انہیں اکبر اعظم کا زمانہ یاد دلایا جب دربار میں ہندو، سکھ اور مسلمان ایک ساتھ بیٹھے ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت سلیم چشتیؒ اور حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کے پیغام کو یاد دلایا کہ کس طرح برصغیر میں صدیوں تک امن قائم رہا اس پر ہندو ممبروں نے اورنگ زیب عالمگیر کو ہاتھوں ہاتھ لیا کہ اُس نے باپ کو کیسے زندانی کیا اور پھر دارا شکوہ جیسے امن پسند بھائی کو مروا دیا جو فقیر، ملنگ، جوگی، بھگت اور سنت تھا۔ سین ول کے بھیجے ہوئے وفد میں جو گورے ممبر تھے وہ بھی پڑھے لکھے تھے۔ انہوں نے اورنگ زیب کے مقابلے پر مسلمان حکمرانوں اور تاریخی حوالوں کے ڈھیر لگا دیئے کہ کیسے مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ حسن سلوک بلکہ گنگا جمنی تہذیب کی بنیاد رکھی۔ ایسے میں میر تقی میر، سودا، غالب، ناسخ، مومن، نظیر اکبر آبادی، امانت لکھنوی سے لے کر علامہ اقبال بلکہ گوپی چند نارنگ تک جو بلوچستان میں پیدا ہوئے اور سرائیکی ان کی مادری زبان تھی تک کے حوالے پیش کیے گئے۔ اس پر ہندو ممبران نے گول میز کانفرنس میں شرکت پر آمادگی ظاہر کر دی۔

گورے ممبروں نے سر جوڑ کر سوچا کہ 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم برطانیہ کی مرضی کے مطابق ہوئی تھی اور بٹوارے کا فائدہ حکومت انگلستان کو ہوا تھا لیکن اُس وقت ہندوستان کے تین ٹکڑے کر کے برطانوی اکابرین نے یہ کیوں نہ سوچا کہ برطانیہ پر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ یہی تین ٹکڑے برطانیہ کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کا سبب بن جائیں گے اور ایسا ہوا تو پھر 1947ء کے خونیں فسادات کو تاریخ یہاں نہیں روک سکے گی۔ اس سوچ نے ممبروں کو آمادہ کیا کہ جو بٹوارہ 1947ء میں ہوا تھا وہ غلط تھا اور اس غلطی کا ازالہ اب ایسے ہو سکتا ہے کہ یہاں موجود تینوں فریقوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ آپس میں مل کر متحدہ ہندوستان بن جائیں۔ یہ دنیا کو اچھا پیغام جائے گا۔ پہلے بھی برطانوی گوروں نے اس تقسیم میں اہم کردار ادا کیا تھا اور اب ہندوستان کو پھر سے متحد کرنے میں بھی انہیں کردار ادا کرنا ہوگا۔ ایسے میں سین ول صبائی کے خیالات سے سب متفق ہو گئے اور گول میز کانفرنس کے لیے مکمل تیاری ہونے لگی۔

اُدھر پاکستانی، انڈین اور بنگلہ دیشی ممبران بھی جوڑ توڑ میں مصروف ہو گئے کہ کون کس کے ساتھ اتحاد کرے کہ اُن کا وزیر اعظم منتخب ہو جائے۔ ایسے میں کچھ لو کچھ دو کے اصولوں کو بھی سامنے رکھا جانے لگا۔ بالآخر تیاری کر کے سب میدان میں اُترے اور گول میز کانفرنس کا پہلا دور شروع ہو گیا۔

انگریز ممبروں نے پہلے تو ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں 1947ء کے فسادات اور اس پر لکھے گئے ادب کا حوالہ دیا۔ پھر بنگلہ دیش کے قیام کی وجوہات پر روشنی ڈالی۔ پھر پاکستان میں دہشت گردی کے نتیجے میں قیمتی جانوں کے ضیاع کا حوالہ دیا۔ پھر پاکستان کے مارشل لاؤں کے نتیجے میں ملک کو پہنچنے والے نقصانات کا

ذکر کیا۔ انڈیا اور پاکستان کے درمیان مسلسل کشیدہ حالات سے دونوں ملکوں کے عوام کو جو نقصان ہوا، اس کی وجہ سے دونوں ملکوں میں نفرت کے کاروبار نے کرکٹ، میوزک، ادب اور فلموں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اسلحہ اور ایٹم بم کی دوڑ نے دونوں ملکوں کے عوام کو غربت کی چکی میں اتنا پیسا گیا کہ اُن کی کئی نسلیں بھوک اور ننگ میں تاریک راہوں میں ماری گئیں۔ اس پر ہندو ممبروں نے کہا کہ واقعی برصغیر کی تقسیم درست فیصلہ نہیں تھا۔ بھارتی مسلمان ممبروں نے تقسیم کے نتیجے میں بھارتی مسلمانوں کی صورت حال پر روشنی ڈالی کہ کیسے انہیں دیوار سے لگا دیا گیا۔ کیسے ہندو انتہا پسندوں نے مسلمانوں کے مذبحہ خانے بند کرا دیے۔ گوشت کھانے پر مسلمانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

پاکستانی مسلمانوں کے لیڈر چوہدری فرزند علی المعروف کھاریاں والے کو کچھ سمجھ نہ آئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ باتیں کچھ کچھ اُس کی سمجھ میں آ رہی تھیں لیکن یہ سمجھ نہیں تھی کہ جواب کیا دے۔ آخر اُس نے وہی بات کی جو اُس کے باپ دادا کرتے آئے تھے کہ ہم نے لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر پاکستان حاصل کیا۔ دو قومی نظریہ، علامہ اقبال اور قائداعظم۔ یہاں تک اُس کا علم فارغ ہو گیا اور پھر اُس نے انگریزوں سے کہا۔ آپ چاہتے کیا ہیں؟ اس پر گورے ممبرز نے کہا ہم اب جو چاہتے ہیں وہ صرف برطانیہ کے مفاد ہی میں نہیں۔ وہ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے مفاد میں بھی ہے اور انہیں یہاں سے اچھا پیغام جائے گا۔ اگرچہ پلوں کے نیچے سے بہت پانی گزر چکا ہے۔ پھر بھی جو پیغام چرچل، برٹرینڈ رسل اور آئن سٹائن نے یورپ کو دیا تھا اُس کا اثر تو بہر حال ہوا ہی تھا۔ ہو سکتا ہے اس پیغام کا اثر بھی تینوں ملکوں تک پہنچ جائے۔

اس پر بنگلہ دیشی ممبرز نے کہا ہم بنگالی ہیں ہمیں الگ رہنا ہے۔ ہمارا رہن

سہن، ثقافت، زبان اور فنونِ لطیفہ سب سے مختلف ہے۔ ہم یہاں اپنی الگ شناخت کے ساتھ رہیں گے۔

اب مسئلہ بھارتی مسلمان ممبروں اور پاکستانی مسلمان ممبروں کا تھا کہ دونوں کا پہناوا مختلف، زبان مختلف اور دونوں کا ثقافتی اظہار مختلف تھا۔ وہ ایسے کہ بھارتی مسلمان ممبروں نے سر پر ٹوپیاں، لمبے کرتے، تنگ پاجامے اور مختلف قسم کی واسکٹیں زیب تن کی ہوئی تھیں جبکہ پاکستانی مسلمان ممبروں نے انگریزی لباس یا پھر پنجاب کا لباس شلوار کرتا، اوپر کوٹ یا واسکٹ، نیچے کھسہ وغیرہ۔ اس سے دونوں الگ الگ پہچانے جاتے تھے۔ بھارتی مسلمان ممبروں نے ہندو ممبروں کو ساتھ ملایا ہوا تھا جو قلیل تعداد میں تھے اس لیے گورے ممبروں کو برصغیر کو دوبارہ متحد کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ سین ول صبائی تحمل سے کام لے کر ہر فریق کو تاریخی اعتبار سے صحیح جواب دے رہا تھا۔ ایک وقت آ گیا کہ مذاکرات میں ڈیڈلاک پیدا ہو گیا۔ ایسا اس قسم کے مذاکرات میں ہوتا ہے۔ انگریز ممبر چونکہ کائیاں تھے۔ انہوں نے لنچ کا وقفہ کر کے مذاکرات کو اگلے راؤنڈ میں ڈال دیا۔

سین ول صبائی اپنی ماں سے ملنے اولڈ ہوم گیا۔ ماں نے اُسے پیار کیا۔ وہ وہیل چیئر پر تھی۔ ساتھ خوبصورت نہر چل رہی تھی۔ سین ول نے ماں کو سیر کرانے کے لیے وہیل چیئر کو گھمایا اور نہر کے کنارے سرسبز بیلٹ پر چلنے لگا۔ ماں نے سین ول سے کہا سانول میرے بیٹے تجھے پتہ ہے تیرا باپ کتنا بڑا آدمی تھا۔ وہ شاعری کا سمندر تھا اور اُس نے پاکستان میں صرف ایک پیغام پھیلایا تھا کہ ہر مرد کو عورت سے محبت کرنی چاہیے۔ کسی نے اُس کے پیغام کو نہ سمجھا اور اُسے ایک راسپوٹین اور بیولاک ایلس سے ملا دیا اور اُسے عورتوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والا قرار دے دیا جبکہ میں جانتی ہوں

عورتیں اُس کے سامنے ایسے آتی تھیں جیسے وہ دیوتا ہو۔ بیٹے مجھے پتہ ہے تم باپ پر نہیں مجھ پر گئے ہو۔ تم بے حد شرمیلے اور صوفی قسم کے آدمی ہو تو یاد رکھو باپ کو بھولنا نہیں وہ بے حد ہتھ چھٹ اور طبیعت کا گرم تھا اُس نے اپنے ٹیلیویژن کے دنوں میں کئی کئی گھنٹے انور سجاد اور امجد اسلام امجد کو کھڑے رکھا تھا۔ اب تم ان دونوں کے نام بھی نہیں جانتے میں جانتی ہوں۔ جب تم اُس باپ کے بیٹے ہو تو پھر تم باپ کے خون اور جینز کا اظہار ضرور کرنا۔ اگر برصغیر مل جائے تو یہ تمہارے باپ کی روح کو سلام ہوگا۔ اس پر سین ول صبیائی (سانول صہبائی) نے کہا ممی بات یہ ہے کہ باپ کو میں نے زیادہ دیکھا نہیں۔ آپ کی بات کے بعد میں کیسے تین مختلف علاقوں یا ملکوں کو لندن میں اکٹھا کرلوں۔ ماں نے کہا مجھے نہیں پتہ مگر میں نے فوک تھیٹر میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ اس لیے میں جانتی ہوں کہ برصغیر ایک تھا اور اُس کا ادب اور فنون لطیفہ ایک تھا جسے چھری سے کاٹا نہیں جا سکتا۔ جیسے سعادت حسن منٹو نے لکھا ہے کہ میرے ہندوستان کو اتنے ٹکڑوں میں کاٹ دیا گیا کہ مجھے سمجھ نہ آئی کہ کیا کسی ملک کو اس طرح بھی کاٹا جا سکتا ہے۔ سین ول (سانول) نے ماں سے مکالمہ جاری رکھا۔

''لیکن ممی پاکستان کے لوگ تو الگ ہو کر خوش تھے پھر کیا ہوا کہ وہاں سے بھی مختلف باتیں سننے میں آئیں۔''

ماں نے کہا'' بیٹا میں نے تو تھیٹر پر کام کیا ہے۔ نوٹنکی پہلی شکل تھی تھیٹر کی۔ پھر فوک تھیٹر آیا۔ ہیر رانجھا، سسی پنوں، لیلیٰ مجنوں اور مومل رانو جیسے کھیل آ گئے اور بالی جٹی کا تھیٹر اُس زمانے میں ایک عورت کی طاقت کے اظہار کی علامت بن گیا۔ اُس کے ساتھ عنایت حسین بھٹی، عاشق جٹ، عالم لوہار اور اس طرح کے لوگ تھیٹروں نے اپنی جگہ بنائی مگر اصل خاتون بالی جٹی تھی۔'' یہ باتیں ماں بیٹے میں ہو رہی

تھیں اور پھر سین ول صبائی کو یاد آیا کہ اُسے کل پھر اُسی میٹنگ میں جانا ہے۔ وہ ماں کو اولڈ ہوم میں چھوڑ کر آیا اور اگلے دن کی تیاری کرنے لگا۔

اگلے دن گول میز کانفرنس کا دوسرا دن تھا۔ سب فریق آ کر اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ البتہ ان میں ایک ممبر کا اضافہ ہوا تھا جو برطانیہ کی رائل فیملی سے لگتا تھا۔ اب اُس کا حلیہ بتانے میں وقت ضائع ہوسکتا ہے۔

گول میز کانفرنس اگلے دن شروع ہوئی تو پاکستانی مسلمان ممبروں نے یہ موقف اختیار کیا کہ چونکہ وہ اکثریت میں ہیں اس لیے وزیر اعظم اُن کا ہونا چاہیے۔ اس پر سب نے ردِعمل ظاہر کیا کہ اسمبلی میں اکثریت دکھائیں اور ووٹ حاصل کریں۔ ہوسکتا ہے گورے ممبر باقی تمام قومیتوں کو ساتھ ملا کر حکومت بنالیں۔ بحث میں بار بار پاکستانی رہنما چوہدری فرزند علی المعروف کھاریاں والے نے دوقومی نظریے کی رٹ لگائی تو گورے رائل فیملی کے ممبر نے اُن سے اس کا مطلب پوچھا تو چوہدری صاحب رٹا رٹایا جواب دے کر خاموش ہوگئے اس پر گورے ممبروں نے پاکستان کے قیام کی کچھ ایسی دستاویزات رکھ دیں جو برٹش میوزیم میں موجود تھیں اور ثابت کیا کہ ریڈکلف نے ہندوستان کے نقشے پر لکیر پھیر کر بٹوارے کی بنیاد رکھی۔ یہ اس کی صوابدید پر تھا کہ کون سا حصہ کس کے پاس جائے گا اس لیے کہ انگریز کو برصغیر سے نکلنے کی جلدی تھی۔ وہ جلدی میں جو فیصلہ کر گئے اس پر آج تک تاریخ کے ماہرین انگلیاں منہ میں دابے بیٹھے ہیں۔ جب بنگلہ دیشی مسلمان، بھارتی مسلمان اور پاکستانی مسلمان ممبر اتحاد پر آمادہ نظر نہ آئے تو اس پر رائل فیملی کے ممبر اور سین ول صبائی نے صاف صاف بتا دیا کہ جو بٹوارہ 1947ء میں ہوا تھا۔ وہ لندن میں برداشت نہیں ہوگا۔ برصغیر کو یہاں متحد ہونا پڑے گا کہ یہ برطانیہ کے لیے ضروری ہے اور اگر ایسا نہ ہوتو یہاں فوج بلالی

جائے گی اور جو کاروبار اسٹیٹس کر رہے ہیں وہ خطرے میں پڑ جائے گا۔ تم لوگ اگر چاہتے ہو کہ یہاں 1947ء والے فسادات نہ پھوٹیں تو ایک بار پھر یہاں متحدہ ہندوستان کا اعلان کر دو جس طرح ہم نے ہندوستان کا بٹوارہ کیا تھا ایسے ہی اسے دوبارہ جوڑ بھی سکتے ہیں۔ پاکستان ممبروں کے لیڈر نے کہا یہ کوئی کاغذ کا نقشہ نہیں جسے آپ سکاچ ٹیپ سے جوڑ دیں گے۔ رائل فیملی کے ممبر کا ماتھا ٹھنکا تو اس نے واضح کر دیا کہ برطانیہ کسی صورت پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کو اپنے ملک میں برداشت نہیں کرے گا۔ تم لوگ اسٹیٹس ہو ہمارے لیے۔ اسٹیٹس بن کر رہو۔ جب ذرا پاکستانی لیڈر نے پاکستان پر کٹ مرنے کی بات کی تو گوروں نے آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کیسا پاکستان؟ جس نے تمہارے خون پسینے کی کمائی پر مختلف حیلے بہانوں سے قبضہ کیا۔ تم لوگوں نے پاکستان میں جو پراپرٹی خریدی اس پر قبضے ہو گئے۔ تم لوگوں نے بیٹیوں کو پاکستان میں بیاہا، وہاں سے تمہاری بیٹیوں کے تابوت واپس آئے۔ کس پاکستان کی بات کرتے ہو تم۔ تمہاری دولت پاکستان میں گئی جسے حکمرانوں نے لوٹ کر واپس ہمارے بینکوں میں ڈال دیا۔ اس پر بنگلہ دیشی اور بھارتی ممبر برطانوی ممبر کے حق میں ہو گئے۔ بھارتی ممبر تو ویسے بھی ہندوستان کو ایک بنانے میں پیش پیش تھے۔ اب بنگلہ دیشی بھی ساتھ مل گئے۔ گورے ممبروں نے آخری وار آزاد کشمیر کے ممبران جن کی اکثریت میرپوری تھی پر کر دیا۔ رائل فیملی ممبر نے کہا دیکھو تم کشمیر کی آزادی کے لیے ترستے رہے۔ تم کشمیریوں نے کتنے شہید کرائے کیا ہاتھ آیا۔ تم آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر میں بٹے رہے آج اگر کشمیریوں کو برطانیہ میں ایک ہونے کا موقع مل رہا ہے تو قدم بڑھاؤ اور ایک دوسرے کو سینے سے لگا لو۔ اس پر مقبوضہ کشمیر سے واحد رکن اسمبلی جو اپنے لوگوں کے حلقے سے منتخب ہوئے تھے کھڑے ہو گئے اور بازو پھیلا

دیئے۔ چند لمحوں پر میر پوریوں کے دو تین ممبر جو بریڈفورڈ سے منتخب ہوئے تھے کھڑے ہوگئے اور گلے لگے۔ یوں لگا جیسے مسئلہ کشمیر حل ہوگیا ہے اور کشمیر پھر سے ایک ہوگیا ہے۔

اب پاکستانی ممبروں کے پاس صرف ایک ہی راستہ رہ گیا کہ وہ وزیراعظم کے لیے کوئی شرط رکھ دیں۔ ممبر رائل فیملی نے گول میز کانفرنس میں فیصلہ سنایا کہ پاکستانی ممبران اگر متحدہ ہندوستان کو قبول نہیں کرتے تو گول میز کانفرنس کو ناکام قرار دے کر نیا جوڑ توڑ کیا جائے گا۔ اس پر چوہدری فرزند علی المعروف کھاریاں والے نے اپنے بزنس کو یورپ اور پوری دنیا میں پھیلانے کے لیے سمجھوتے کی چادر اوڑھنے کا فیصلہ کیا اور یہ طے کیا کہ وہ وزیراعظم تو بن نہیں سکتا تو کیوں نہ کسی مسلمان ممبر کو وزیراعظم بنا کر سرخرو ہوجائے تو اُس نے شرط رکھ دی کہ وزیراعظم اگر مسلمان ہو تو وہ ہندوستان میں دوبارہ شامل ہوکر خود کو برصغیر کا حصہ بنا سکتے ہیں۔

یہاں مورخ کی کامیابی ہوگئی کہ جس تقسیم یا بٹوارے کو مورخین نے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ اب وہ بٹوارہ پھر سے متحدہ ہندوستان میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اگرچہ علامتی طور پر ہی سہی مگر دنیا اور تینوں ملکوں کو پیغام تو جا رہا تھا اور برطانیہ نے جس طرح ہندوستان کی مختلف ریاستوں پر الگ الگ شب خون مارا تھا۔ اتنے سالوں بعد وہ ریاستیں اب ایک ہونے جا رہی تھیں۔ لیکن پاکستانی ممبرز کا مطالبہ کہ وزیراعظم مسلمان ہوگا۔ بظاہر مشکل لگتا تھا کہ انڈین ممبروں، پاکستانی ممبروں اور بنگلہ دیشی ممبروں کو لگا کہ شاید اُن میں سے کسی کا انتخاب ہوسکتا ہے۔ لیکن جب رائل فیملی کے ممبر نے اعلان کیا کہ برطانیہ کا منتخب وزیراعظم مسلمان ہوگا اور اُس کا نام ہے سین ول صبائی۔

اس پر مسلمان ممبروں پر اوس پڑ گئی کہ سین ول صبائی تو گورا تھا لیکن فوراً ہی

ساری حقیقت دستاویزی ثبوت کے ساتھ گورے ممبروں نے سامنے رکھ دی کہ لاہور کے احمد صہبائی کا بیٹا سانول صہبائی دراصل پنجاب کے ہیرو کے نام پر سانول رکھا گیا تھا جس کو یہاں گوروں نے سیمن ول بنا دیا تھا۔

پاکستانی ممبروں نے کہا اور تصدیق مانگی تو گورے ممبروں نے سانول کا کچا چٹھا کھول دیا کہ احمد صہبائی جو پاکستان ٹیلیویژن کا افسر تھا اس نے ایک گوری سے شادی کی تھی تو سانول نام کا بچہ پیدا ہوا تھا۔ جو اب وزیراعظم بننے جا رہا تھا۔ اس دستاویزی ثبوت کے بعد پاکستانی ممبروں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور سانول صہبائی کے نام پر سمجھوتہ کر لیا۔

احمد صہبائی کا بیٹا حلف اٹھا رہا تھا اور متحدہ ہندوستان دوبارہ یہاں مکمل ہو رہا تھا۔ اس پر کسی مورخ کی نظر ہی نہ گئی۔

☆☆☆

ہمارے ہیرو واپس کرو

افغان دارالحکومت کابل میں دفتر خارجہ نے پاکستانی سفارتخانے کے اعلیٰ افسر کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور اپنی حکومت کی طرف سے انہیں آگاہ کیا کہ پاکستان نے گزشتہ رات طالبان کے مبینہ ٹھکانوں پر کئی راکٹ لانچر اور میزائل داغے جن سے طالبان کا کیا نقصان ہوا اس سے انہیں کوئی غرض نہیں۔ ایک دو میزائل افغان سکیورٹی کی دو چوکیوں پر گرے جس سے ان کے چار جوان ہلاک ہو گئے۔ اس پر افغان حکومت شدید غم و غصے کا اظہار کرتی ہے اور تنبیہہ کرتی ہے کہ آئندہ یہ حرکت کی گئی تو اسے افغانستان پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی ایک احتجاجی مراسلہ اعلیٰ افسر کے حوالے کیا گیا جس پر شق وار شکایات درج تھیں۔ اعلیٰ افسر نے جب اسے پڑھا تو آخری شق پر وہ چونکے۔ انہیں سمجھ نہ آئی کہ افغان حکومت نے یہ شق کیوں لکھی ہے اور افغان حکومت کو اتنی دہائیوں بعد کیسے اس بات کا خیال آیا ہے۔ اس شق میں لکھا تھا کہ حکومت پاکستان آئندہ اپنے میزائلوں کے نام ہمارے قومی ہیروز پر رکھنے سے باز رہے۔ یہ ایک ستم ظریفی ہے کہ حکومت پاکستان ہم پر ہمارے ہیروز کے ناموں کے میزائل داغے جا رہی ہے۔ افغان حکومت کو ان میزائلوں کے ٹکڑوں کو جمع کر کے معلوم

ہوا ہے کہ یہ میزائل افغان حکمرانوں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ یہ میزائل اور راکٹ لانچر غوری ایک، غوری دو، غوری تین وغیرہ ہیں۔ غزنوی اور ابدالی کے نام سے بھی اسلحہ بنایا گیا ہے اور ہم پر استعمال ہوا ہے۔ اُدھر سنا ہے محمد بن قاسم کا نام بھی اسی طرح کی جنگی سرگرمیوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حکومت پاکستان کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ ہمارے ہیروز کو استعمال کرنے کا گھناؤنا دھندہ بند کرے اور اپنے مقامی ہیرو تلاش کرے۔ اگر مقامی ہیرو دستیاب نہ ہوں تو ہم سے باقاعدہ اجازت لے کر ہمارے ہیروز کے ناموں کو برانڈ کرے اور اس کی فیس ادا کرے جیسے کاروباری دنیا میں کسی بھی ٹریڈ مارک کی فیس ادا کی جاتی ہے۔

پاکستان کے اعلیٰ افسر کا ماتھا ٹھنکا۔ اگرچہ اس کے ماتھے اور انتظار حسین کے ماتھے میں بہت فرق تھا اس لیے کہ ماتھا ٹھنکنے کا پاکستان میں لائسنس صرف انتظار حسین کے پاس تھا۔ اعلیٰ افسر نے مراسلہ وصول کیا اور اپنی مہنگی مرسڈیز میں واپس ایمبیسی میں آیا۔ سفیر صاحب اتفاق سے فوج کے کوٹے سے آئے تھے۔ فارن آفس نے سٹرٹیجک فارن پالیسی کے تحت فارن آفس یا سیاسی کوٹے سے یہاں سفیر کا تقرر نہیں کیا بلکہ فوج کے کوٹے سے تقرر کیا گیا۔ ایکسی لینسی سفیر صاحب کو جب اعلیٰ افسر نے مراسلہ پیش کیا تو اس کا بھی ماتھا ٹھنکا۔ اس کی وجہ ملک کی توہین نہیں تھی بلکہ وجہ یہ تھی کہ افغان حکومت نے اس کے قبیلے کو نظر انداز کیا تھا۔ وہ اصلی نسلی پٹھان تھا۔ درانی قبیلے کا چشم و چراغ اور ایک غیور فوجی افسر تھا۔ شکل و صورت سے وہ مین کلر لگتا تھا۔ بلی آنکھیں، بھوری مونچھیں، گالف کا کھلاڑی اور ٹھیک سات بجے بلیک لیبل کھولنے والا جی دار شہزادہ تھا۔ اس نے مراسلہ دیکھا اور اعلیٰ افسر کے سامنے پھاڑ دیا۔ اعلیٰ افسر کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ پھٹا ہوا مراسلہ اٹھا لیتا کیونکہ وہ ریکارڈز کا حصہ تھا اور اسے سرکاری

فائل میں بہرحال لگنا تھا۔ ایکسی لینسی سفیر صاحب نے اپنا پیگ تیار کیا۔ دو گھونٹ لیے اور دھیمی آواز میں گرجا۔ اب آپ دھیمی آواز میں گرجنے کو نہیں سمجھ سکتے تو میرا قصور نہیں ہے۔ سفیر صاحب نے اعلیٰ افسر کو اپنا احتجاجی بیان ریکارڈ کرایا کہ افغان وزارت خارجہ نے کمینگی اور تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے غوریوں، غزنویوں اور ابدالیوں کو ہیرو قرار دے کر میرے قبیلے کی توہین کی ہے۔ تاریخ میں نادر شاہ درانی کا بہت کلیدی کردار ہے اسے بھی ہیروز میں شامل کرنا چاہیے تھا۔ مشہور مزاح نگار شفیق الرحمٰن نے موسیقی کے حوالے سے بھی ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ ہر حملے کے بعد نادر شاہ ایک نیا راگ ایجاد کرتا تھا جسے بڑے بڑے گویے گاتے تھے۔ نادر دِنا، نادر دِنا، نادر دِنا، نادر دِنا، نادر دِنا، نادر دِنادا... اس بات پر سفیر صاحب کی سٹی گم ہوگئی مگر تیسرا پیگ پینے کے بعد اس کی سٹی واپس آگئی اس پر اعلیٰ افسر کی جان میں جان بلکہ امان آئی تو سفیر صاحب نے وزارت خارجہ کے نام ایک نوٹ لکھوایا جس میں ساری واردات لکھوانے کے بعد کہا گیا کہ حکومت پاکستان کو اس واقعے سے سبق سیکھنا چاہیے اور ملک کے سفارتخانوں کو شرمندگی سے بچانے کے لیے ہمسایہ ملکوں کے ہیروز استعمال کرنے یا چرانے سے گریز کرنا چاہیے اور اگر یہ ضروری ہو تو آئندہ نادر شاہ کے نام کا میزائل بھی تیار کیا جائے بصورت دیگر حکومت پاکستان کو ایک وزارت مقامی ہیروز قائم کرنی چاہیے جو مقامی ہیرو تلاش کر کے وزارت دفاع کی رہنمائی کرے۔ اعلیٰ افسر نے وزارت خارجہ کے لیے ڈوزیئر تیار کیا۔ ڈوزیئر کا مطلب بھوفٹ کرنا ہوتا ہے۔ یہ وہ خوراک ہوتی ہے جو کسی بھی مستحق مریض کو دی جاتی ہے۔

اب وزارت خارجہ اور وزارت دفاع کے سرکاری غیر سرکاری اور میڈیا کے تجزیہ کار متحرک ہوگئے اور مل کر بیٹھ گئے کہ حملہ آوروں کو کب تک ہیرو بنائیں گے اور

استعمال کریں گے کیوں نہ اپنے مقامی دیسی اور پاکستانی ہیرو تلاش کیے جائیں۔

اس حوالے سے ایک بڑی کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں دانشور، مورخ، تجزیہ کار اور فوجی ماہرین شامل کیے گئے۔ ان کی ہنگامی میٹنگ بلائی گئی۔ اجلاس شروع ہوا تو پہلا سوال یہ تھا کہ غوری، غزنوی، ابدالی اور درانی تو پاکستان میں آباد قومیں ہیں اس لیے ان کو غیرملکی کہنا تو سراسر زیادتی ہے اور افغان وزارت خارجہ کو یہ ہمت کیسے ہوئی کہ وہ ہمارے ہیروز کو اپنا کہے۔ اس پر سول سوسائٹی کے ایک ممبر نے بصد ادب عرض کیا جو انسانی حقوق کے لیے خاصا بدنام تھا کہ حضور تاریخ بھی پڑھ لینی چاہیے جو باور کرائی ہے کہ ہندوستان جس میں اس وقت پاکستان بھی شامل تھا ایک ایسا خطہ تھا جس پر کوئی بھی چڑھ دوڑتا تھا۔ ایسا یسیم ویسیر خطہ جس کے پاس ہاتھی بھی تھے، گھوڑے بھی تھے اور عوام بھی تھے۔ لیکن وہ ایسا خصی قسم کا خطہ ثابت ہوا کہ جو بھی افغانستان کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا اس نے ملتان تک مار کی اور یہ محاورہ وجود میں آیا کہ جس حکمران کا ملتان مضبوط ہوگا وہی حکومت کر سکے گا۔ اب ایسا ہوا کہ باہر سے قبیلے آتے رہے اور معمولی سی مزاحمت پر وہ ہمارے سروں پر بیٹھتے تھے اور یہاں مقامی آبادیوں کی خوبصورت، قبول صورت اور معمولی شکل وصورت کی لڑکیوں سے شادیاں کر کے ہر نقش اور ہر رنگ کی نسلیں پیدا کرتے رہے اور ایک وقت آ گیا کہ مقامی اور افغانی نسلیں گھل مل گئیں۔ اس لیے اب غوری، غزنوی، ابدالی اور درانی وغیرہ سب پاکستانی تصور کی جائیں گی۔

ایک قوم پرست اور سچا محب وطن پاکستانی ممبر بولا۔ پھر بھی یہ ہماری توہین ہے کہ ہمارے میزائلوں کے نام افغان حملہ آوروں پر رکھے جائیں۔ کچھ بھی ہو یہ نام طاقت کے سرچشمے کے طور پر ہی رکھے گئے ہیں اور طاقت کا سرچشمہ حملہ آور کو قرار نہیں

دیا جا سکتا۔ طاقت کا سر چشمہ عوام ہوتے ہیں لہٰذا ہمیں تجویز کرنا چاہیے کہ میزائلوں، ٹینکوں اور اس طرح کے بھاری اسلحہ کے نام مقامی ہیروز کے ناموں پر رکھے جانے چاہئیں۔ جیسے قائداعظم، قائدملت، قائدعوام، قائد جمہوریت وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان ناموں پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔ ایک سیانے دفاعی تجزیہ کار کا ماتھا ٹھنکا یہ ماتھا انور مقصود مارکہ تھا۔ اس نے فرمایا جناب قائداعظم کو آپ نے بہت استعمال کر لیا ہے اسے بخش دیں۔ قائداعظم ایئرپورٹ سے لے کر قائداعظم یونیورسٹی تک ہم روزانہ بہت کچھ سنتے ہیں۔ جب یہ خبر آتی ہے کہ قائداعظم ایئرپورٹ پر طالبان کا حملہ ہو گیا۔ قائداعظم ایئرپورٹ پر سیکڑوں مسافر فلائٹس منسوخ ہونے سے بے یار و مددگار ہو گئے یا قائداعظم یونیورسٹی کی کئی ایکڑ زمین پر لینڈ مافیا کا قبضہ ہو گیا تو اس نام کی حرمت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ویسے بھی قائداعظم مدبر لیڈر تھے، وہ امن پسند صلح جو رہنما تھے جو جنگوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ آپ ان کے نام کے میزائل داغیں گے جس سے انسان فوت ہو جائیں تو قائداعظم کی روح پر کیا گزرے گی۔ 1947ء کے فسادات میں لاکھوں انسانوں کی ہلاکت پر قائداعظم نے اتنا افسوس کیا تھا کہ چارپائی سے لگ گئے۔ پاکستان کے ایک کونے زیارت میں گوشہ نشیں ہو کر رہ گئے۔ اب رہ گئے تو قائدملت تو ایک معمولی سی گولی سے ڈھیر ہو گئے ان کے نام کا میزائل تو راستے میں پھنس ہو کر رہ جائے گا۔ باقی رہ گیا قائدعوام اسے آپ نے پھانسی دیدی جو آخری جملہ یہ لکھ گیا۔

دروازوں وی ماری ولڑی جلیل اے

تو ان کے نام کا میزائل کیا معنویت دے گا۔ پھر قائد جمہوریت کا کیا کریں گے جو حقہ پیتے تھے۔ شعر کہتے تھے۔ ووٹ ان کو ملتے نہیں تھے۔ مارشل لاؤں نے ان

کو قائد جمہوریت بنا دیا۔ اس بحث میں ایک آزاد فکر صحافی جو آئی ایس پی آر کے بہت کام آتا تھا۔ اس لیے اس مشاورتی کمیٹی میں شامل تھا۔ اس نے تھوڑا فلسفیانہ اور تھوڑا دانشورانہ انداز اختیار کرتے ہوئے اس خطے کی ثقافتی، سماجی اور تہذیبی تاریخ پر دس منٹ کا لیکچر دیا جس میں گندھارا، انڈس ویلی، ہڑپہ، موہنجوداڑو، محمد بن قاسم، راجہ داہر، مہر گڑھ سے لے کر امیر خسرو، حضرت نظام الدین اولیا، بابا فرید بہاء الدین زکریا، شاہ لطیف بھٹائی تک بے شمار صوفیا کے نام آئے یہاں تک کہ کبیر اور بابا گورونانک کو بھی مسلمانوں کے کھاتے میں پیش کر دیا۔ اس پر چیئرمین کمیٹی نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ بھائی آپ کہنا کیا چاہتے ہیں اس پر وہ صاحب ذرا سٹپٹائے مگر فوراً سنبھل گئے اور کہنے لگے ہمارے صوفیا سے بڑھ کر کوئی دیسی ہیرو ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کے ناموں کو ہم قومی فتح و نصرت کے لیے استعمال کر سکتے ہیں، یہ اسی دھرتی کے سپوت تھے۔ اس پر ایک مذہبی خیالات اور اسلامی تاریخ سے استفادہ کرنے والے کالم نویس نے بھی حصہ لیا اور بتایا کہ ہماری فوج میں اسلامی تاریخ کا بہت عمل دخل ہے تو کیوں نہ اسلامی تاریخ سے مدد لی جائے۔ خالد بن ولید محمد بن قاسم تو ہمارے ہیرو ہیں ہی۔ کچھ اور شامل کر دیے جائیں مثلاً طلحہ بن زبیر، حسان بن ثابت، طارق بن زیاد وغیرہ وغیرہ۔ اس پر ایک نسبتاً کمزور دانشور اور آدھے صحافی نے گرہ لگائی کہ صاحبو یہ سب نام محترم ہیں۔ مگر خدشہ یہ ہے کہ ان ناموں کے میزائل بنانے پر عرب دنیا سے احتجاج آ سکتا ہے کہ ہم ان کے ہیرو بغیر اجازت کے کیوں استعمال کر رہے ہیں۔ بے شک ہم مسلمان ہیں مگر ان ہیروز کا ٹریڈ مارک تو ان کے پاس ہے ہم استعمال نہیں کر سکتے۔ عرب دنیا جب احتجاج کرے گی تو ہم کیا کریں گے۔ اس کے بعد ایک ترقی پسند اور ذرا لبرل قسم کے تجزیہ نگار نے چونچ کھولی کیونکہ اس کا منہ چھوٹا

تھا۔اس نے ڈرتے ڈرتے کہا اس دھرتی کے وہ سپوت جو غلامی کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے جانیں قربان کر گئے وہ سچے بہادر تھے۔ان کے ناموں کے میزائل بنانے چاہئیں۔ایک بزرگ فوجی افسر نے عینک اُتارتے ہوئے کہا آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں۔ایسے کسی بہادر کو تو میں نہیں جانتا۔کہیں تم نے سعادت حسن منٹو کے افسانے تو نہیں پڑھے۔اس پر وہ ترقی پسند اور لبرل سوچ کے تجزیہ نگار نے جواب دیا کہ سر اگر میں منٹو کو پڑھ لیتا تو پھر میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نام کا میزائل بنانے کی سفارش کرتا یا میں ''ٹیٹوال کا کتا'' کے اس فوجی سپاہی کے نام کا میزائل بنواتا جو سرحد کے اس پار پاکستانی سپاہی کی گولی سے مرجاتا ہے اور پاکستان کی سرحد سے اس کا دوست اسے گالی دیتا ہے کہ'' اڑے بلونت سیاں تو گالاں بہت کڈیاں۔ہن بولدا کیوں نہیں۔تو میتوں گساکیوں کرایا۔'' آگے سے جواب نہ آیا۔

اور میرے پاس تو منٹو کے کئی کردار تھے جن کے نام ہی میزائل تھے کاش آپ نے وہ کردار پڑھ لیے ہوتے تو ہمیں مقامی ہیروز تلاش نہ کرتے پڑتے۔

ترقی پسند لبرل دانشور جو آئی ایس پی آر کے زیر اثر تھا نے بات کاٹ کر کہا ہمارے بے شمار ہیروز تو ہمارے ناولوں اور افسانوں میں ہیں لیکن وہ آپ کو سمجھ نہیں آسکتے۔

اب بیچ میں کوئی صوفیا کا ذکر آ گیا اور کسی نے کہا کہ ہمارے اصل ہیرو تو صوفیا کرام ہیں۔کیوں ناں ان کے ناموں پر میزائل اور ٹینک بنائے جائیں اور افغانستان کی حکومت کو اس کا جواب دیا جائے۔اس پر سامنے جو نام آئے وہ خوشحال خان خٹک کا بھی تھا۔سب میں ایک تاریخ شناس بھی تھا۔وہ بھڑک اٹھا کہ واہ کیا نام آیا ہے۔خوشحال خان خٹک تو باقاعدہ جانباز اور تلوار چلانے کے ہنر میں مشاق تھا لیکن انسانی حقوق کے ایک چیمپئن نے اس کے ارمانوں پر اوس ڈالتے ہوئے کہا۔ان کی

شاعری تو محبت سے لبریز ہے، وہ جنگجو نہیں تھے صرف فن سپہ گری جانتے تھے، اس کے بعد بہاء الدین ذکریا، داتا گنج بخش، رحمان بابا، وارث شاہ، لطیف بھٹائی اور حق باہو جیسی ہستیوں کے نام سامنے آئے سب نے ان ناموں پر اتفاق کیا۔ پھر بحث شروع ہوئی کہ ان میں سے کن ناموں پر کس قسم کے میزائل بنائے جائیں۔ اس پر ایک خاموش قسم کے نیم سرکاری اور نیم صحافی قسم کے تجزیہ نگار نے پھریری لی اور گویا ہوئے کہ صاحب جو نام آپ نے برصغیر کے صوفیا اور اولیا کے لیے ہیں یہ سب انصاف پسند، امن پسند اور رواداری کے علمبردار تھے جس وجہ سے اس خطے میں اسلام کو پھیلنے کا راستہ ملا ورنہ ہم سب ہندو، سکھ یا عیسائی یا شودر ہوتے۔ آپ اگر مقامی ہیرو تلاش کرنا چاہتے ہیں تو پھر سنیں۔ احمد خان کھرل، سوبھاش چندر بوس، بھگت سنگھ، حسن ناصر، ایاز شیخ، امر جلیل اور بہت سے جمہوریت کے متوالے۔ اس پر خاموشی چھا گئی اور چیئرمین نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ مجھے ان سب ناموں کا سرے سے پتہ ہی نہیں۔ اگر ہم کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں تو ہمارے پاس صرف سات دن ہیں۔ اس لیے ناموں کو آج شارٹ لسٹ کرنا ضروری ہے۔ چیئرمین کے ایک چمچے نے فوری حل نکالا کہ سر صوفیا کے ناموں پر اتفاق کرلیں۔

ایسے میں اس اجلاس میں ایک آرمی افسر اندر آیا اور اس نے چیئرمین کے سامنے ایک کاغذ رکھا اور وہ چلا گیا۔ چیئرمین نے فخریہ اعلان کیا کہ حضرات ابھی اطلاع آئی ہے کہ پاک فوج نے نیا میزائل بنایا ہے جو خطے میں منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ دنیا میں کسی ملک نے یہ تجربہ نہیں کیا۔ اسے "بابر تھری" کا نام دیا گیا ہے۔ لوجی اب تیموری خاندان کا چشم و چراغ ظہیر الدین بابر بھی آ گیا۔ ترقی پسند لبرل سوچ کے ممبر نے اس پر فوری ردعمل ظاہر کیا۔ اب سوال یہ سامنے آیا کہ افغانوں کے بعد

اب سنٹرل ایشیا کے حکمرانوں نے بھی پاکستان آرمی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے۔ اس پر ایک انسانی حقوق کا چیمپئن چیخا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پوری دنیا میں دہشت گردی کی لہر میں ازبکستان اور چیچنیا شامل ہیں۔ ازبکستان تو بابر کا ملک ہے اب ہم ازبکوں کو بابر تھری سے ماریں گے یا ازبک ہمیں قائداعظم تھری سے ماریں گے یہ فیصلہ کب ہوگا؟ اس پر ایک عمر رسیدہ خاموش صحافی بولے کہ ویسے تو مغلیہ خاندان اور خاندان غلاماں کا اثر رسوخ افغانوں ہی کا مرہون منت ہے کہ سنٹرل ایشیا سے حملہ آور کابل سے ہی ادھر آتے تھے اور شیر شاہ سوری نے ان کے لیے راستے بنا دیے تھے۔ کسی نے ٹوکا کہ یہ تحقیق غلط ہے۔ جی ٹی روڈ شیر شاہ سوری نے نہیں بنائی لوگوں نے بنائی جو راستے کچی زمین پر انسانوں کے چلنے سے بن جاتے ہیں۔ اسے ہم کسی حکمران کے کھاتے میں نہیں ڈال سکتے۔ کسی نے ذرفطنی چھوڑی کہ ہندوستان نے شیر شاہ سوری کے نام کا میزائل "سوریہ" بنایا ہے۔ ایک تاریخ دان نے یہ غلط فہمی دور کر دی کہ سوریہ نام ہندو مائیتھالوجی سے لیا گیا ہے۔ اس نام سے ہوٹل بھی ہیں اور کئی ادارے کام کر رہے ہیں۔ پھر بھی جب پاکستان کی اسلحہ ساز فیکٹریوں نے بابر تھری کا تجربہ کیا تو پتہ چلا کہ بابر ایک اور بابر دو بھی اسی تاریخ کا حصہ ہیں اور بہت پہلے داغے جا چکے ہیں۔ اب تو اس میٹنگ میں گھمسان ہی مچ گیا۔ مقامی ہیروز کا معاملہ تو دور کی بات ہے پھر بھی سب کے ماتھے ایک ساتھ ٹھنکے کہ پاکستان میں صرف افغانستان نہیں سنٹرل ایشیا سے بھی حملہ آور آئے تھے۔ ایک سیانے فوجی نے یہ معاملہ سلجھا دیا کہ سنٹرل ایشیا تیموری خون اور ترک النسل قومیں آئیں جن میں امیر خسرو اور مرزا غالب بھی تھے۔ اب تو معاملہ بہت ہی گڑبڑا گیا کہ اصل ہندوستانی کون ہے اور حملہ آور کون ہے۔ برا ہوا افغان حکومت کا جس نے ہندوستان اور پاکستان کو ایک نئے چکر میں

ڈال دیا۔ ہندوستان نے تو اپنا معاملہ طے کرلیا تھا کہ 1947ء کے بعد وہ اپنی بچھڑی ہوئی تاریخ سے رشتہ بنانے میں کامیاب ہوگیا اور اشوک اعظم سے خود کو جوڑ لیا اور پھر ہندوستان کو انتظار حسین مل گیا جس نے ان کی تاریخ کے رشتوں کو نہ صرف دریافت کیا بلکہ پاکستان کے عصری مزاج کے ساتھ بھی جوڑ دیا اور یہ انہوں نے فی سبیل اللہ کیا۔ مودی سرکار کا اس پر خرچہ نہیں ہوا کیونکہ مائیتھالوجی ایک ایسا ذریعہ ہے کہ وہ سب طرح کی معروضی حقیقتوں پر پردے ڈال دیتا ہے اور ہم تو گندھارا سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور احمد خان کھرل سے بھی۔ باقی کیا رہ گیا وہی حملہ آور۔ اب تو بار تین کا تجربہ بھی ہو چکا ہے تو ایسے میں دیسی ہیروز کی کمیٹی کیا کرسکتی ہے۔ آخر پھر ایک نیم دانشور اور نیم تجزیہ نگار نے پھریری لی اور کہا صوفیا کے ناموں پر مجھوتہ کر کے تجویز تیار کریں۔ اس پر ترقی پسند لبرل نے پرانی بات دہرائی کہ بہاء الدین زکریا، خوشحال خٹک، حضرت شہباز قلندر اور بلھے شاہ کے نام کے میزائل بنالیں اس سے برکت پیدا ہوگی۔ اس پر سیانے دفاعی تجزیہ نگار نے اپنی پہلی بات دہرائی کہ صاحبو ان ناموں پر پاکستان ریلوے نے گاڑیوں اور ہماری یونیورسٹیوں کے نام رکھے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی میں اب تک غبن وغیرہ کی کئی وارداتیں ہوچکی ہیں یہاں تک کہ وائس چانسلر کو ہتھکڑیاں لگ چکی ہیں،، رجسٹرار فرار ہو چکا ہے اور اسی یونیورسٹی کا لاہور کیمپس سرکار کے ایک چہیتے نے اپنے نام کرالیا ہے۔ اسی طرح زکریا ایکسپریس کئی بار پٹڑی سے اتر چکی ہے، کئی بار خوشحال خٹک سے ٹکرا چکی ہے اس لیے ان بزرگوں کو معاف کریں۔ اب جو رول ماڈل رہ گئے وہ تو ادیب اور شاعر قسم کے لوگ ہیں۔ اس پر میٹنگ میں ایک ہلچل پیدا ہوئی۔ ایک نے کہا فیض کے نام کا میزائل بنایا جا سکتا ہے۔ وہ کرنل کے عہدے پر رہے ہیں۔ آئی ایس پی آر کے گرگ جہاندیدہ

نے عینک آنکھوں سے ہٹا کر کہا۔ کیا ہو گیا ہے تاریخ کو ذرا بھی نہیں جانتے۔ فیض 1952ء میں راولپنڈی سازش کیس کے سزا یافتہ ہیں ان کے نام کا میزائل تو غداری ہوگی۔ کسی نے کہا حفیظ جالندھری کا نام موزوں ہے۔ انہوں نے قومی ترانہ لکھا تھا۔ دوسرے نے تنک کر کہا۔ ارے بھائی اب قومی ترانہ دشمن کے ملک میں پھینکیں گے؟ پھر کسی نے منیر نیازی اور ناصر کاظمی کا نام لیا تو سب ہنسنے لگے کہ جناب جن شاعروں نے یہ شعر لکھے ہوں وہ دشمن سے کیا لڑ سکیں گے:

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

....

منیرؔ اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

کسی نے جان ایلیا کا نام لے دیا۔ اس پر تو بہت ہنسی اُڑی اور کسی نے کہا جان ایلیا کے نام کی شراب تو بنائی جا سکتی ہے میزائل نہیں۔ اس پر چائے کا وقفہ ہو گیا۔ جب سب دوبارہ جمع ہوئے تو ان کے منہ لٹکے ہوئے تھے وہ اپنے دیسی ہیرو تلاش کرنے میں خود کو ناکام محسوس کر رہے تھے۔ چیئر مین نے شکست کا اعلان کیا اور مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا کہ ہمارے اپنے ہیرو اسلحے کے نام کے لیے موزوں نہیں ہے اس طرح سب نے دستخط کیے اور وہ معاملہ داخل دفتر ہو گیا۔

اُدھر افغانستان میں ہندوستان کے دفتر خارجہ کے افسران نے ایک میٹنگ کی۔ جس میں بلوچستان میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے کے تجارتی راستوں اور مقاصد کے ذریعے قدم جمانے کا پروگرام طے کر دیا۔ اس حوالے سے جو پیکیج بنایا گیا

اس میں یہ سرفہرست تھا کہ افغانستان اپنے ہیرو چوری ہونے کے آنسوئے نہ بہائے۔ انڈیا ان کے ہیروز کے ناموں کے میزائل بنا کر انہیں دے دے گا۔ اس طرح غوری، غزنوی، ابدالی، درانی اور بابر نام کے میزائل انڈیا افغانستان کو تیار کر کے دینے پر تیار ہو گیا۔ بدلے میں بھارت کو بلوچستان تک رسائی میں افغانستان مدد کرے گا جیسے کبھی طالبان کی مدد پاکستان نے کی تھی۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ افغانستان میں کابل کی وزارت خارجہ نے پاکستان کے سفارتخانے کے اعلیٰ افسر کو طلب کیا اور ایک مراسلہ ہاتھ میں تھمایا کہ بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان نے کئی میزائل سرحدی چوکی پر گرائے جس سے دس طالبان ہلاک ہوئے اور دو سکیورٹی اہلکار زخمی ہوئے جو میزائل گرائے گئے وہ غوری، غزنوی، ابدالی، درانی کے ساتھ بابر نام کے تھے۔ اس پر حکومت افغانستان شدید غم و غصے کا اظہار کرتی ہے کہ پاکستان کی حکومت تنبیہہ کے باوجود ہمارے ہیرو طالبان کی سرکوبی کے لیے استعمال کر رہی ہے اور بابر نام کے میزائل پھینکنے کا ایک ہی مقصد ہے کہ ازبکستان سے اور سنٹرل ایشیا سے افغانستان کے تعلقات خراب کیے جائیں یہ کسی صورت برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کو اپنے میزائلوں کے نام فوراً بدلنے ہوں گے ورنہ ہم مقابلہ کریں گے۔

عین اسی روز اسلام آباد میں افغان سفارت خانے کے اعلیٰ افسر کو دفتر خارجہ میں طلب کیا گیا اور ایک مراسلہ دیا گیا کہ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے چمن کی سرحد پر افغان فوجیوں نے میزائل پھینکے ہیں جس سے بیس طالبان ہلاک اور ایک پاکستان اہلکار زخمی ہوا ہے۔ حکومت پاکستان اس پر اپنا احتجاج ریکارڈ کراتی ہے کہ یہ کسی صورت برداشت نہیں کیا جائے گا کہ ہمارے ہیروز کو ہمارے

خلاف استعمال کیا جارہا ہے۔ غوری، غزنوی، ابدالی، درانی اور بابر ہمارے ہیرو ہیں ان ناموں کے میزائل ہم پر گرائے گئے تو حکومت پاکستان اسے جنگ تصور کرے گی۔

افسانہ ختم ہوتا ہے اور بریخت کے مشہور ڈرامے گلیلیو کا آخری حصہ سامنے آتا ہے۔ بریخت لکھتا ہے کہ جب مذہبی پنڈتوں نے گلیلیو کو موت کی سزا سنادی تو اس کی بیٹی نے رات کو آخری ملاقات کی اور باپ سے استدعا کی کہ صبح عدالت میں وہ اپنے بیان سے انکار کردے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اس سے زمین سورج کے گرد گھومنا تو بند نہیں کرے گی۔ البتہ اُن کی جان بخشی ہو جائے گی۔ اگلے دن گلیلیو نے عدالت میں اپنے بیان سے انکار کردیا اور جب وہ عدالت کی سیڑھیاں اُتر رہا تھا تو اس کے شاگردوں نے جو اس انکار سے ناخوش تھے اس پر طنز کیا: ''افسوس ہے اس قوم پر جس نے آج ایک ہیرو کو جنم نہیں لینے دیا۔''

گلیلیو مڑا اور جواب دیا کہ ''افسوس ہے اس قوم پر جو ہر روز ایک نیا ہیرو مانگتی ہے۔''

ہمارا مورخ لکھتا ہے کہ کل کے حملہ آور آج کے ہیرو بن چکے ہیں اور تین ملکوں کی ضرورت پوری کررہے ہیں۔

☆☆☆

سمندر پر کیا گزری

ایک دن پہلے تک وہ سمندر ہمارا تھا۔ ہم جو سب اس کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی میں آباد چلے آتے تھے۔ تین رنگوں کے سمندر کے کنارے ہم شاید صدیوں سے آباد تھے۔ فیروزی، ہلکا نیلا اور بہت گہرا نیلے رنگ کا یہ سمندر ہمیں خوراک دے رہا تھا۔ ہم نے کبھی اُس میں اپنے وجود اور اپنی ضرورت سے بڑا جال نہیں پھینکا تھا۔ سمندر ہم سے خوش چلا آ رہا تھا۔ اس کی نشانی صبح اور شام کے وقتوں میں اس کا شانت چہرہ تھا۔ جس پر مسکرانے کی لہریں ہمیں بتاتی تھیں وہ ہمارا دوست ہے۔

اچانک ایک صبح جب ہم بیدار ہوئے اور سمندر کے پاس گئے تو وہاں موجود ایک سرکاری اہل کار نے بتایا کہ سرکار نے سمندر بیچ دیا ہے۔ اب آپ اس کے قریب نہیں جا سکتے۔

''سرکار نے سمندر کیوں بیچ دیا ہے۔''

''یہ تو سرکار کی مرضی ہے۔''

''سمندر اور ریاست کی زمین برائے فروخت نہیں ہوتی۔''

''کیوں نہیں ہوتی۔ جو شے سرکار کی ملکیت ہے وہ بیچی اور خریدی

جا سکتی ہے۔''

''سرکار نے سمندر کس کے ہاتھ اور کس قیمت پر بیچا ہے۔''

''یہ سرکاری راز ہے ہم نہیں بتا سکتے۔''

''کیا ہم سمندر سے خوراک لے سکتے ہیں۔''

''نہیں جب تک قوانین نہیں بن جاتے تم لوگ سمندر سے خوراک نہیں لے سکتے۔''

اس بات پر پوری بستی میں سناٹا چھا گیا۔ وہ سب سکتے میں آ گئے۔ اس لیے کہ سرکار نے صرف سمندر ہی نہیں بیچا تھا آسمان اور دھوپ بھی ساتھ ہی بک گئی تھی اور وہ زمین اور ساحل بھی اس کے ساتھ ہی بک گیا تھا۔ اب تو بستی والوں پر بجلی گر پڑی۔ ایک بزرگ نے باور کرایا کہ ان کے بزرگوں کی قبریں بھی اسی زمین پر ہیں۔ کیا وہ بھی بیچ دی گئی ہیں۔ ایک اور بزرگ جو مچھلیوں کو خشک کر کے کھانے کے قابل بنانے کا ہنر جانتا تھا بہت تشویش سے بولا۔ ہمارے اس سمندر کا پتہ کس نے سرکار کو دیا۔ ایک نوجوان بولا۔ یہ سمندر دنیا کے نقشے پر موجود ہے سرکار اس کے متعلق جانتی تھی۔

''لیکن اب تک تو کسی سرکار نے اسے بیچنے کا نہیں سوچا تھا۔ اب یہ کون آیا ہے جس نے اسے فروخت کر دیا ہے۔'' بزرگ نے کہا۔

''یہ نیا حکمران ہے جو تجارت کرتا ہے۔ جس کی دنیا میں تجارت پھیلی ہوئی ہے۔ وہ جانتا ہے کسے بیچنا ہے اور کسے کس بھاؤ خریدنا ہے۔''

''اتنا بڑا سمندر بیچ کر سرکار اس پیسے کا کیا کرے گی۔''

''سرکار کے بڑے خرچے ہوتے ہیں۔ سرکار نے سمندر کچھ سوچ کر ہی بیچا ہوگا۔''

''مگر سوال یہ ہے کہ سمندر تو ہمارا تھا صدیوں سے۔ سرکار اس سمندر سے کیا تعلق رکھتی ہے۔ دن رات اس کے کنارے ہم نے مناجات کی ہیں اور یہ ہمیں پہچانتا ہے۔ کوئی سمندر کی مرضی پوچھے بغیر کیسے اُسے بیچ سکتا ہے۔ سمندر ہم سے باتیں کرتا ہے۔ سمندر ہم سے خوش ہوتا ہے تو اُس کی لہریں ہم سے کلام کرتی ہیں۔ سمندر اُداس ہو تو خاموش ہو جاتا ہے۔ وہ ہمیں اور ہمارے بچوں کو جلال بھی دکھاتا ہے اور جمال بھی۔ اُسے کوئی ہماری مرضی کے بغیر کیسے بیچ سکتا ہے۔''

''اس سے بھی بڑا سوال یہ ہے کہ سرکار کے پاس بیچنے کے لیے کچھ باقی نہیں بچا تھا جو اس آخری کونے میں چھپے ہوئے سمندر کو بیچ دیا۔''

''شاید سرکار سب کچھ بیچ چکی ہو اور اب بیچنے کے لیے کچھ نہ بچا ہو۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سرکار پر بہت سا قرضہ چڑھ گیا ہو اور اُسے اتارنے کے لیے یہ سمندر اب آخری سرکاری جائیداد ہو۔ جسے بیچنا ضروری ہو۔''

''ویسے یہ سرکار کون ہے؟ کس کی ہے۔'' ایک بزرگ نے پوچھا۔

''سرکار سرکار ہوتی ہے۔ اُس کا نہ کوئی نام ہوتا ہے۔ نہ اتہ پتہ وہ بس سرکار ہوتی ہے۔''

''تو ہم کس سے بات کریں۔''

''بات تو سرکار سے ہی ہوگی مگر سرکار ہے کہاں۔''

اس پر ایک نیا سوال اُٹھ گیا اور بستی والے سرکار کا سراغ لگانے لگے کیونکہ سرکار کا اُن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ البتہ کسی نے اس پر یہ سوال بھی اٹھایا کہ جب سرکار کا ہم سے تعلق نہیں تو پھر وہ ہماری سرکار تو نہیں ہو سکتی۔ پھر ہم اُس کی بات کیوں مانیں۔ اس پر ایک سیانے نے کہا سرکار کے پاس توپیں ہیں۔ بندوقیں ہیں۔ بہت سا اسلحہ ہے

وہ ہمیں رعایا بنا سکتی ہے۔ اس پر کسی نے کہا بنا نہیں سکتی۔ ہم اُس کی رعایا ہیں۔ اب تو یکدم پوری بستی کے بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں میں ایک سراسیمگی پھیل گئی کہ ہم تو کبھی بھی کسی کی غلام نہیں رہی تھی۔ اس لیے کہ یہاں کہانی نے مجھے روکا اور کہا کہ اس موقع پر آپ کو ذرا پیچھے لے جاتے ہیں۔ میں نے کہا "ہاں کہانی کا چلن تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ کبھی پیچھے آ جاتی ہے کبھی آگے جاتی ہے تو بولو۔"

"کہانی نے بتایا کہ یہ سمندر یہاں کئی صدیوں سے بسرام کرتا تھا اور اُسے ضرورت تھی کہ کوئی اُسے پہچانے یا دریافت کرے تو ایک دن دوپہر کے وقت دور سے ایک عورت چلتی ہوئی ہمارے اس سمندر کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی اور گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ شام تک وہ بیٹھی رہی اور شام کے بعد وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ اس طرح وہ عورت ہر روز آتی تھی اور شام کو چلی جاتی تھی۔ یہ سمندر اُس عورت سے مانوس ہو گیا تھا کہ سمندر کو کوئی ساتھی نصیب ہو گیا تھا۔ سمندر کی مچھلیاں اور آبی حیات اُچھل اُچھل کر اُس عورت کو سلام پیش کرتی تھیں۔ وہ عورت صبح آتی تھی اور شام کو چلی جاتی تھی۔ وہ ایک خاموش عورت تھی اور سمندر خوش ہوا کہ اُسے کوئی ساتھی مل گیا ہے۔ تو اس طرح دن رات چلتے رہے۔ ایک دن کیا ہوا؟ کہ اُس خاموش عورت کو دور سے ایک آدمی آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ پہر دوپہر کے بعد وہاں پہنچ گیا۔ وہ نہیں معلوم کس کھوج میں نکلا تھا اور یہاں کیسے پہنچا۔ وہ آدم زاد اپنے جیسے دوسرے آدم زاد اور وہ بھی عورت کو دیکھ کر خوش ہوا اور وہ بھی صبح شام وہاں رہنے لگا۔ موسم آتے گئے جاتے گئے۔ سمندر رنگ بدلتا، پہلو بدلتا اور شکلیں بدلتا رہا۔

سمندر اُن دونوں سے مانوس ہو چکا تھا۔ دونوں عورت اور مرد اپنی اپنی زمین پر صبح کو آتے شام کو چلے جاتے۔ ایک دن کہ سمندر خروش میں تھا۔ ہوا تیز تھی اور سمندر

شدید اضطراب میں تھا۔ اس سمندر میں دور تک کوئی سمندری بیڑا یا جہاز یا کشتی کبھی نہ گزری نہ دور سے دکھائی دی۔ یہ عجب طلسماتی سمندر تھا شاید یہ جہازوں کی گزرگاہ نہیں تھا۔ اُس دن کیا ہوا؟ وہ مرد جو کبھی اُس عورت سے ہم کلام نہیں ہوا تھا۔ اُس کے قریب آیا اور" کہا کہ میں تمہیں ایک عرصے سے دیکھ رہا ہوں۔ تم کس لیے یہاں آتی ہو۔ وہ عورت بولی تم کس لیے یہاں آتے ہو۔"

"میں تمہارے لیے آتا ہوں۔"

"تم مجھے جانتے ہو۔"

"ہاں میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ اسی طرح کے ایک سمندر کے کنارے ایک لڑکی کھڑی ہے کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ بس اُسی کھوج میں گھر سے نکلا اور اس سمندر پہ آ گیا جہاں تم کھڑی تھی۔"

"وہ کوئی اور سمندر بھی تو ہو سکتا ہے۔ تم غلط سمندر کے ساحل پر آئے ہو۔"

"وہ کیسے؟ یہ وہی خواب کا ساحل ہے۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے کسی اور کا انتظار ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔ وہ میں ہی ہوں۔"

"نہیں میں جانتی ہوں وہ کوئی اور ہے اور وہ کسی اور سمت سے آئے گا۔"

"کیا تم اُسے جانتی ہو۔"

"نہیں مگر وہ مجھے جانتا ہے اور اُسے آنا ہے ایک دن۔"

"اگر وہ نہ آیا تو....."

"اُسے آنا ہے۔"

"میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ کیوں نہ ہم ایک جھونپڑی ڈال کر زندگی

کو نئے سرے سے شروع کریں۔ سمندر ہم دونوں کی خوراک کے لیے بہت وسیع ہے۔''

''لیکن میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں اور اس کا انتظار مجھے ہر حال میں کرنا ہے۔''

''پھر ایک تجویز ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ تم اپنی طرف سے ایک دن مقرر کرلو۔ اُس دن تک میں انتظار کروں گا۔ اگر وہ اُس دن تک نہ آیا تو پھر تم میرے ساتھ رہنے کا وعدہ کرو۔''

''اس پر اُس عورت نے سوچا اور پھر اُسے سو دنوں تک انتظار کرنے کے لیے کہا۔''

''ٹھیک سو دن بعد میں آؤں گا۔ یاد رکھنا تم نے وعدہ کیا ہے۔''

اس کے بعد وہ مرد ذات اُس عورت کو دکھائی نہیں دیا۔ مگر سو دن گزرتے کیا زمانہ لگتا ہے۔ دن ایک ایک کر کے گزرتے گئے۔ آخر وہ دن آ گیا جس کا وعدہ اُس مرد ذات سے عورت نے کیا تھا، ابھی دن چڑھا ہی تھا کہ وہ نمودار ہو گیا اور عورت کو دیکھنے لگا۔ دن ذرا پہر دو پہر آگے آیا تو وہ بھی سرکتا ہوا اُس کے پاس آنے لگا۔ مگر عورت کی نگاہیں سمندر کے آسمان سے ملتے ہوئے کنارے پر تھیں۔ وہ شام سے پہلے اُس کے پاس آیا اور کہا" یہ وعدے کا دن ہے۔ آج سو دن مکمل ہوئے۔ اب اپنا وعدہ پورا کرو۔'' تو اُس نیک بخت نے کہا۔

''ابھی ابھی سو دن مکمل ہونے میں ایک ڈیڑھ پہر باقی ہے۔''

''کیا وہ اس آخری پہر میں آجائے گا۔''

''آ بھی سکتا ہے۔''

''نہ آیا تو کیا تم میرے ساتھ رہنے لگو گی۔''

اچانک عورت نے دیکھا اسے ایک مستول نظر آیا جو کشتی کے بادبان کو سنبھالے ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ کشتی ساحل کی طرف آنے لگی۔ سورج غروب ہونے میں کچھ وقت تھا۔ اس پر مرد ذات کا ماتھا ٹھنکا، عورت کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ وہ کشتی آہستہ آہستہ ہوا کے زور پر ساحل کی جانب آتی گئی۔ اب کشتی واضح ہو رہی تھی جسے ایک آدمی ساحل کی جانب دھکیل رہا تھا۔ سورج آہستہ آہستہ سمندر کی طرف ڈوبنے والا تھا۔ جب سورج سمندر میں تانبے کی چمکتی تھال جیسا ڈوب گیا تو کشتی کنارے لگی اور اس میں سے ایک خوبصورت مرد کہ جس کا ڈیل ڈول کسرتی تھا اور جو محنت اور جفاکشی کے باعث بہت مثالی بدن کا مالک تھا۔ باہر آیا۔ اور اس عورت سے لپٹ گیا۔ اس نے اس کا بوسہ لیا اور پھر وہ ایک طرف کو چل دیئے۔

اجنبی مرد جدھر سے آیا تھا اُدھر کو روانہ ہوا۔ پھر اس جوڑے نے یہاں رہائش کی اور رہنے لگے۔ زمانہ گزرا اُن کی اولاد اور پھر اُن کی اولادوں سے یہ جگہ ایک بستی کا روپ اختیار کر گئی۔ معلوم نہیں کتنے زمانے اس سمندر کے ساحل پر آباد اس بستی پر گزرے کہ اب اچانک ان پر آفت ٹوٹ پڑی کہ جب سرکار نے سمندر فروخت کر دیا۔ لیکن سمندر کا پتہ کس نے دیا۔ اس پر سر جوڑ کر جب سب نے غور کیا تو معلوم ہوا ایک تاجر یہاں آیا تھا جس نے اس سمندر کا سراغ لگایا تھا۔ اب بات سب کی سمجھ میں آنے لگی کہ سمندر سے بستی والوں نے بدعہدی کی تھی۔ جس کا یہ نتیجہ نکل رہا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ بستی والے اپنی خوراک سمندر سے لیتے رہے اور وہ خوراک ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ ضرورت سے زیادہ مچھلی آ جاتی تو اُسے سکھا کر رکھ لیتے اور مشکل دنوں میں

گزارا کرتے۔ ایک دن ایک اجنبی وہاں آیا۔ حلیہ اُن سے مختلف تھا۔ وہ بات بھی بہت لچھے دار کررہا تھا۔ سب چھوٹے بڑے جوان بزرگ عورت مرد اُس کے گرد جمع ہوگئے تو اُس نے سمندر کے راستے تجارت کا عندیہ ظاہر کیا۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ تجارت سے متعلق کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

''تجارت کیا ہوتی ہے؟''

''باہر سے مال جہاز کے ذریعے یہاں سمندر میں آئے گا اور اُس مال کو شہروں تک ٹرکوں میں پہنچایا جائے گا۔''

''مال کیا ہوتا ہے؟''

''ضرورت کی اشیاء جو سمندر پار کے ملکوں سے منگوائی جاتی ہیں۔''

''سمندر پار بھی کوئی ملک ہے۔''

''ہاں ہاں سمندر کے اُس پار بھی سمندر ہے۔ دنیا سمندر نے گھیر رکھی ہے۔ ہم تو بس ٹکڑوں میں آباد ہیں۔''

''ہمارے علاوہ بھی دنیا میں مخلوق ہے۔''

''یہ جو آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ یہ بھی تو ایک مخلوق ہے۔''

''نہیں نہیں یہ تو ہم جانتے ہیں۔ مطلب ہمارے جیسے دنیا میں اور لوگ بھی ہیں۔ ہم تو اس زمین سے باہر نہیں گئے۔''

''تو سن لو تمہاری اس زمین سے باہر کئی دنیا ئیں آباد ہیں اور اُن سب کو تمہارے اس سمندر کا علم ہے۔ اس لیے کہ سمندر اپنے جیسے سمندر سے جڑا ہوا ہے۔ جبکہ تم اپنی جیسی مخلوق سے جڑے ہوئے نہیں ہو۔''

''تو پھر ہم کیا کریں۔ ہم پر تو حملہ ہوگیا ہے۔''

''ہاں ٹھیک کہا تم نے۔ وہ جو باہر کی دنیا کو نہیں جانتے اُن پر حملہ ہو جاتا ہے۔''

''مگر ہم باہر کی دنیا کو کیسے جانتے۔''

''وہ ایسے کہ تمہارے میں کسی ایسے آدمی کا جنم ہونا چاہیے تھا جو دنیا کی دریافت کے لیے نکلتا۔ جو ایسا طاقت ور ہوتا جو ہر طرح کی سختی کو جھیل جاتا۔''

سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ شرمندہ ہوئے اور تب سب کو معلوم ہوا کہ اپنی زمین اور سمندر کی حفاظت کے لیے ایک طاقت ور آدمی تو چاہیے۔ ورنہ کوئی بھی کہیں سے آئے گا اور فتح کر لے گا۔ اس پر ایک دانش مند نے کہا ''سنو اگر کوئی طاقت ور بھی ہمارے درمیان ہوتا تو کیا یقین تھا کہ ہم پر حملہ آور غالب نہ آتا۔ تو یہ ثابت ہوا کہ باہر کی دنیا نے ہمیشہ اندر کی دنیا کو فتح کیا ہے۔ سو ہم فتح ہو گئے ہیں۔''

اس گفتگو کے بعد جو اجنبی آیا تھا تجارت کا جھنڈا لے کر۔ اُس نے بستی والوں کو باور کرایا کہ ''گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ میں باہر کا حملہ آور نہیں ہوں۔ میں آپ سب کی زندگیاں بدل دوں گا۔''

اس پر ایک مدبر اور دانش مند بزرگ کا ماتھا ٹھنکا۔ اور وہ بولا۔

''وضاحت کرو اے تاجر نما شخص۔''

''تو سنو اے بزرگ میں اس سمندر پر جہاز لاؤں گا جو شراب اُتارے گا اور اُس کے ساتھ میں کچھ کپڑے، کچھ اناج، کچھ اور اشیا بھی ہوں گی۔''

''یہ شراب کیا ہوتی ہے۔''

''شراب ایسا مشروب ہوتا ہے جسے پی کر تم پر چاروں طبق اور سات آسمان آشکار ہو جاتے ہیں۔''

''کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے۔''

''ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔''

''میں سات آسمان اور چاروں طبق دیکھنا چاہوں گا۔''

یہ سب سے بڑے بزرگ نے کہا۔

''تو پھر سمندر پر جو جہاز آ کر رُکے گا اُس پر آپ کے لوگ کوئی پابندی نہیں لگائیں گے؟''

''اس کے بدلے میں ہمیں سات آسمان اور چاروں طبق دیکھنے کو ملیں گے؟''

''ہاں ہاں ضرور ملیں گے۔ جو شراب جہازوں سے اُترے گی اُس کا ایک حصہ آپ کو دے دیا جائے گا۔''

''اُس سے کیا ہوگا۔''

''وہ شراب آپ کو سات آسمانوں کی سیر کرائے گی اور تمہارے چاروں طبق روشن ہو جائیں گے۔''

اس پر بستی کے لوگ مسکرائے۔ مسرور ہوئے اور سوچنے لگے۔

اُس تاجر نے کہا ''کیا سوچ رہے ہو۔''

''ہم سوچ رہے ہیں کہ ہماری مچھلیوں کا کیا ہوگا۔''

''وہ بھی تم کو ملیں گی۔''

''اتنے بڑے جہازوں سے مچھلیاں خوفزدہ نہیں ہوں گی؟''

''مچھلیوں کے ساتھ رہتے تمہاری نسلوں کی کئی عمریں گزر گئیں۔ پھر بھی نہیں جانتے مچھلی سمندر کی مخلوق ہے اور سمندر اُس کا آنگن ہے۔ وہ خطرہ سونگھ کر سمندر کے

نیچے تہہ میں چلی جاتی ہیں اور پھر وہ سمندر میں اپنی مرضی کے سمندر میں کوچ کر جاتی ہیں۔''

''مگر کبھی کبھی مچھلیاں سمندر میں بھی مر جاتی ہیں۔ اوپر مردہ مچھلیاں سطح پر تیرنے لگتی ہیں۔''

''مچھلیوں کی بھی عمر ہوتی ہے۔ پھر مچھلیوں کو کھانے والی زخمی کرنے والی مچھلیاں بھی ہوتی ہیں۔''

''سمندر کے اندر کی دنیا کو تم کتنا جانتے ہو۔''

''وہ ایسے کہ میں سمندر میں تجارت کرتا ہوں اور جو سمندر پہ تجارت کرتا ہے اُسے سمندر کے اور چھور کا بھی پتہ ہوتا ہے۔''

ایک بزرگ بولا۔

''سمندر پر تجارت کرنے والے۔ کسی دن سمندر کی تجارت نہ کر دینا۔ یہ ہمارے بچوں کا رزق ہے اور ہمیں پالتا ہے۔ اسے مت چھیننا۔''

تاجر مسکرایا اور دیکھا سب کو اور پھر کمینگی سے بولا۔

''تاجر ساحلوں پر جب اُترتے ہیں تو اُسی دن اُسی وقت سمندر بک جایا کرتے ہیں۔ لیکن آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کلکتہ کے ساحل پر بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کا جہاز اترا تھا۔ وہ تجارت کے لیے آیا تھا۔''

''یہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور یہ کلکتہ کیا ہے۔ یہ تو ہم نہیں جانتے یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''میں وہ کہہ رہا ہوں جو تم سن رہے ہو۔''

''تو پھر ہمیں بتاؤ تم سمندر کو بیچ دو گے۔''

''معصوم لوگو..... سوال یہ بنتا ہے کہ کیا تم سمندر کو خرید لو گے؟''

''تو پھر ہمیں بتاؤ ہم کیا کریں؟''

''ہاں اب تم صحیح سوال پر آئے ہو۔'' تاجر مسکرایا جیسے اُس نے اُس آبادی کو خود انہی کے جال میں پھنسا لیا ہو۔ اور پھر تاجر کا راستہ صاف تھا۔ ایک اور ایسٹ انڈیا کمپنی سوسوا سو سال بعد وجود میں آ رہی تھی۔ مگر کہاں؟ وہاں جہاں کبھی ہندوستان کی طاقت موجود ہی نہیں تھی۔ یہ نئی ایسٹ انڈیا کمپنی بلوچستان کے ایک ساحل پر اُتر رہی تھی۔ اُتر بھی رہی تھی کہ نہیں۔ یہ بھی ایک سوال تھا۔ لیکن سمندر تو اُس تاجر نے لے لیا تھا۔

''اچھا تو پھر جب یہاں جہاز سامان اتاریں گے تو آپ نہیں بولیں گے۔''

وہ آبادی تو جیسے گنگ ہو گئی تھی اور پھر یوں ہوا کہ ایک دن ایک جہاز وہاں آ کر اُترا۔ آبادی والے وہاں آ کر اُس کو دیکھنے لگے۔ یہ کیا عجیب و غریب دیو ہیکل مجسمہ تھا۔ جو آ کر رُکا اور پھر بے شمار ٹرک اور گاڑیاں آ گئیں اور اندر سے بے شمار سامان جو معلوم نہیں پڑتا تھا کہ کیا ہے۔ ان گاڑیوں میں سوار ہونے لگا اور اس طرح وہ جہاز آتے اور جاتے رہے۔ اس دوران سمندر کے باسیوں کو شراب کی بوتلیں ملنے لگیں اور پھر یوں ہوا کہ بزرگ اور ادھیڑ عمر کے لوگ شراب کی بوتلوں کے لیبل دیکھ کر حیران ہوتے رہے اور پھر وہ نشے میں گم ہوتے رہے۔ مچھلی تو پھر بھی ان کی خوراک رہی۔

شراب نے اُن کی زندگی کو بدل دیا۔ وہ اپنی عورتوں سے زیادہ شراب سے محبت کرنے لگے۔ اب وہ اپنی عورتوں کے ساتھ سمندر سے بھی غافل رہنے لگے۔ سمندر سے اُن کا رشتہ بس جہازوں کی آمد اور مچھلی کے سمندر سے نکالنے تک محدود

ہو گیا۔ اب اکثر اوقات عورتیں سمندر سے جال کے ذریعے مچھلی نکالنے لگیں۔ پھر اچانک ایسا ہوا کہ ایک دن جال میں کوئی مچھلی نہیں پھنسی۔ بستی والوں پر جیسے ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مچھلیاں کہیں پانی کی تہہ میں جا بسیں یا وہ ساحل چھوڑ کر کہیں کسی اور سمت کوچ کر گئیں۔ ایک اور بات جو بستی کے لوگ نہیں جانتے تھے۔ وہ یہ تھی اُس تاجر نے کچھ اور کمپنیوں کو اس سمندر کے ٹھیکے دے دیے جو جدید قسم کے ذرائع سے مچھلیاں اور قیمتی لابسٹرز، جھینگے اور دیگر اقسام کی سمندری حیات کو نکالنے لگے۔ بستی والوں کے جال اب اتنی گہرائی تک جانے کے قابل کہاں تھے؟ سو اُن کے جال خالی نکلتے۔

ایسے میں بڑی اہم تبدیلیاں جلدی جلدی رونما ہونے لگیں۔ سمندر نے اپنی رنگت بدلنی شروع کر دی۔ اب وہ تین رنگوں کا سمندر نہیں رہا تھا۔ ساحل پر جہازوں کی آمد و رفت اور علاقے میں گاڑیوں کے دھوئیں نے فضا کو ہی نہیں سمندر کو بھی آلودہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن بستی والوں کو صرف اس بات کی چنتا تھی کہ شراب اور مچھلی کا تسلسل نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ ایک دن جب مچھلی نہ نکلی تو چند دن سوکھی مچھلی پر گزارا کیا۔ پھر تو بزرگوں کو ان کی عورتوں نے جھنجھوڑا کہ خواب غفلت سے نکلیں اور یا تو ہجرت کر کے کسی اور ساحل پہ جا کر آباد ہوں یا اپنے ساحل پر قابض ہونے والوں کا مقابلہ کریں۔ مردوں میں مقابلے کی سکت شراب نے چھین لی تھی۔ اب تو مکمل اطاعت ہی اُن کی بچت کا باعث ہو سکتی تھی۔ ایک دن جیسا کہ شروع میں کہانی نے خود کو بیان کیا ہے کہ سمندر کو فروخت کر دیا گیا تھا۔ تو ایسا ہوا کہ اب سرکار کے کارندے دن بھر ادھر اُدھر گاڑیوں میں آتے جاتے دکھائی دیتے۔ پھر کیمپ آفس قائم ہونے لگے۔ بستی والوں کو اس ساری صورت حال سے اب کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ان کا سمندر تو ان سے آہستہ

آہستہ چھن چکا تھا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے سرکاری خدمت میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا۔ اب بستی کے گرداگرد بے شمار خیمے، دفاتر اور بھاری مشینری کے ساتھ ساتھ عجیب وغریب چہروں والی مخلوق بستی والوں کو دکھائی دی جو انہوں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اس مخلوق کا قد چھوٹا تھا۔ رنگ گورا تھا۔ چہرے چوڑے تھے۔ ناک چپٹے تھے۔ یہ مخلوق معلوم ہوا کہ پوری دنیا پر اپنے قدم جما رہی ہے۔ مگر بستی والوں کے حصے میں صرف حیرت آئی۔

اب جب بستی والوں نے سرکار سے اپنا علاقہ واپس لینے کے لیے بستی کے لوگوں کا وفد بنایا تو وہ تاجر اپنے ساتھ سرکار کے لوگوں کو لے کر آ گیا اور چکنی چپڑی باتوں کے بعد بولا۔

''دیکھو میں نے تم کو شراب پلائی اور ساحل کو ایک نیا جیون دیا۔ اب اس ساحل سے کروڑوں لوگ روزی کماتے ہیں۔ پہلے صرف تم سو سوا سو خاندان روزی لیتے تھے۔ اب دیکھو کہ تمہارا ساحل پوری دنیا پر آشکار ہو چکا ہے۔''

''مگر ہم تو کسی دنیا کو نہیں جانتے۔''

''مگر دنیا تو موجود ہے۔ تم جانو یا نہ جانو۔''

''اب کیا ہوگا۔ ہم تو صرف شراب اور مچھلی مانگتے ہیں۔''

''اب نہ شراب ملے گی نہ مچھلی۔''

''کیوں نہیں ملے گی؟''

''اس لیے کہ تمہارا سمندر فروخت ہو چکا ہے۔''

''مگر یہ تو اُسی دن فروخت ہو گیا تھا جب پہلا جہاز شراب لے کر یہاں اُترا تھا؟''

"بزرگ! اب تم نے خود ہی سچ بول دیا ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ میں تمہارے لیے ایک پیغام لایا ہوں۔"

بستی والے سب جمع ہو گئے کہ اب کیا پیغام آیا ہے۔ وہ تاجر جو سرکار کا ترجمان بن کر آیا تھا بولا۔

"یوں تو اس سمندر کو تجارتی مقاصد کے لیے سب سے پہلے میں نے استعمال کیا۔ مگر اب سرکار اس کی مالک ہے اور سرکار کا ایجنٹ ہوں۔ سرکار نے یہ سمندر ایک ملک کو بیچ دیا ہے۔ اس ملک نے آگے کئی ملکوں سے سمجھوتے کر کے اس کو کرائے پر چلانے کے کئی ٹھیکے دے دیے ہیں۔"

یہ ساری باتیں اُس بستی کے لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ سمندر تو ویسے بھی اُن سے پردہ کر گیا تھا۔ اب وہ سوچ رہے تھے۔ اُنہیں کھانے اور پینے کے لیے سرکار کیا اعلان کرتی ہے۔ اُن میں سے ایک بزگ بولا۔

"یہ جو سرکار ہے یہ ہماری تو نہیں ہے۔ پھر ہم ہر شے اسے کیوں دیں۔"

"اس لیے کہ سرکار کے پاس بندوقیں ہیں۔ توپیں ہیں۔ فوج ہے۔ تمہارے پاس کیا ہے؟"

"سرکار ہم سے بات کر کے جو شے بھی لے رہی ہے۔ اس کا معاوضہ دے۔"

"ہاں اب تم لوگوں نے ٹھیک بات کی ہے اور ہم اس لیے آئے ہیں کہ یہ بستی بھی سمندر کے ساتھ بک چکی ہے۔ تم لوگوں کو اسے خالی کرنا ہے اور تمہارے لیے سرکار نے کچھ مکان ایک طرف یہاں سے فاصلے پر بنائے ہیں۔ تمہیں وہاں جانا ہے اور سرکار نے تمہارے نوجوان عورتوں اور مردوں کے لیے روزگار دینے کا

وعدہ کیا ہے۔''

''ہم یہ جگہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ہمارے آباؤ اجداد کی بسائی ہوئی ہے اور ان کا قبرستان بھی یہاں ہے۔''

''قبرستان سرکار نے تمہارے لیے الگ سے بنایا ہے۔ تم چاہو تو آج ہی ان قبروں کا قبضہ لے سکتے ہو۔''

''ہمارے بزرگوں کی قبروں کا کیا ہوگا؟''

''اُن کی دیکھ بھال سرکار کرے گی۔ ویسے سرکار کے پاس اتنی بڑی مشینیں ہیں کہ وہ تمہارے بزرگوں کی قبریں جڑوں سے اُکھاڑ کر نئے قبرستان میں گاڑ دیں گے۔''

پھر ایسا ہوا کہ وہ بستی ہمیشہ کے لیے مٹا دی گئی۔ سمندر کے سامنے بے شمار تعمیرات ہو گئیں اور سمندر چھپ گیا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے کئی جگہوں پر چیک پوسٹیں بن گئیں۔ رکاوٹیں کھڑی ہو گئیں۔ دنوں، مہینوں، سالوں میں وہاں ایک بہت بڑا شہر آباد ہو گیا۔ بستی والوں کی جوان عورتوں اور مردوں نے مزدوریاں کر کے اپنی آنے والی اولادوں کو پالا اور شہر کے پچھواڑے ان کی آبادی بڑھنے لگی۔ رات دن بھاری بھاری گاڑیاں آتی رہیں جاتی رہیں۔ جہاز رُکتے رہے۔ جاتے رہے پھر بستی والوں نے پہلی بار ہوائی جہازوں کا اڈا دیکھا جہاں سے جہاز اڑان بھرتے اور اُترتے رہے۔ بستی والوں نے حیران کن مخلوق آتے جاتے دیکھی۔ سفید چمڑیوں والے، سیاہ چمڑیوں والے، چھوٹے قد اور بڑے قد والی مخلوق۔ طرح طرح کے لباسوں اور بولیوں کے ساتھ اونچی اونچی عمارتوں اور خوبصورت گاڑیوں کے ساتھ وہاں آباد ہو چکے تھے۔ شروع شروع میں ان غیر ملکیوں پر حملوں اور اغوا کی وارداتوں کی خبریں

بھی گردش کرنے لگی تھیں۔ پھر وہاں فوج اور مسلح افراد اپنی اپنی وردیوں میں ہر طرف دکھائی دینے لگے۔ مختلف ملکوں کے رنگ برنگے جھنڈے وہاں ہر عمارت پر لہرانے لگے۔ بستی والے سمندر پر رکنے والے جہازوں پر مزدوری کرنے لگے اور بھول گئے کہ کبھی یہ سمندر اُن کا ہوا کرتا تھا۔ اب تو وہ ساحلی پٹی کا علاقہ کسی اور ملک میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اُس بستی کے لوگ تو رعایا میں تبدیل ہو چکے تھے۔ مرنے والے مر چکے تھے جو بعد میں پیدا ہوئے وہ غلام پیدا ہوئے تو اب غلاموں نے کیا سوچنا کیا دیکھنا تھا۔

ایسے میں ایک دن معلوم نہیں کتنے سالوں بعد ایک آدمی اُس بستی کے لوگوں کے پاس آیا۔ وہ بستی جو غلام بن چکی تھی۔ عورتیں اور مرد مزدور بن چکے تھے۔ وہ آدمی آیا تو سب بستی والے یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ وہ ہزاروں سال پرانا لگتا تھا۔ وہ اُن میں سے نہیں تھا جو ان کی بستی پر شہر بسا چکے تھے اور سمندر کو اُن سے اوجھل کر چکے تھے۔ وہ قریب آیا تو معلوم ہوا یہ وہ آدمی ہے جو سمندر پر اُس وقت آیا تھا جب وہ عورت سمندر کے ساحل پر کسی کا انتظار کرتی تھی۔ اور یہ وہ آدمی تھا جو اُس عورت کو چاہتا تھا اور اس بستی کو آباد کرنے کے لیے اس کے بطن سے بچے پیدا کرنا چاہتا تھا لیکن یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی۔ وہ سامنے آیا اور بولا۔

"مجھے تم نہیں جانتے۔ یہ میرا دوسرا جنم ہے۔ تم لوگ دوسرے جنم پر یقین نہیں رکھتے۔ میں بھی نہیں رکھتا۔ دوسرا جنم تیسرا جنم ہوتا ہے مگر کس شکل میں ہوتا ہے یہ بھی میں نہیں جانتا۔ میں کون ہوں؟ کیوں آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے میں اصلی شکل اور حقیقت میں نہیں آیا۔ میں بستی والوں کے لیے خواب بن کر آیا ہوں تو میں ایک خواب ہوں۔ یہ خواب دیکھ لو۔ کل میں خواب سے نکل کر سڑکوں پر تمہارے سامنے ہوں گا۔ مجھے تمہاری ماں سے محبت تھی جس کی کوکھ سے اس بستی نے جنم لیا ہے۔ میں اُسی محبت

میں یہاں آیا ہوں اور میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارے سمندر پر کئی ملکوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور سرکار نے یہ سمندر ایک ملک کو نہیں کئی ملکوں کو گروی رکھ دیا تھا۔ اب وقت ہے کہ سمندر اور بستی کی زمین کو آزاد کرایا جائے۔ آزادی کی تحریک آج سے شروع کرتے ہیں کیا میرا ساتھ دو گے۔"

بستی والے یہ سن کر حیران ہو گئے اور بچوں نوجوانوں میں ایک لہر دوڑ گئی اور اس پُراسرار آدمی کے پیچھے وہ سب چل پڑے اور پھر کیا ہوا؟ یہ تو ایک تاریخ ہے اور تاریخ کبھی رکتی نہیں۔ تھکتی نہیں۔

☆☆☆